مسلمانوں کی فکری وحدت میں
آزادی رائے کا کردار

ڈاکٹر عبدالمجید النجار

ترجمہ
محی الدین غازی

کتاب: مسلمانوں کی فکری وحدت میں آزادی رائے کا کردار
مصنف: ڈاکٹر عبدالمجید النجار
مترجم: محی الدین غازی
کمپوزنگ:
صفحات: ۱۰۰

بسم الله الرحمن الرحيم

فہرست

مقدمہ: ڈاکٹر طہ جابر علوانی ۷

تمہید ۲۷

فصل اول: مسلمانوں کی فکری وحدت ۳۰

۱۔فکر ۳۰

۲۔فکری وحدت ۳۱

۳۔فکری وحدت کا محرک ۳۳

۴۔مسلمانوں کی فکری وحدت کے ارکان ۳۶

فصل دوم: آزادی رائے اور مسلمانوں کی فکری وحدت ۴۷

۱۔آزادی رائے ۴۷

۲۔آزادی رائے کے لئے شرعی بنیاد ۵۰

۳۔آزادی رائے اور نگاہ کی ہمہ گیریت ۵۵

۴۔آزادی رائے اور وحدت سازی ۵۹

۵۔آزادی رائے اور حقیقت پسندی ۶۳

۶۔آزادی رائے اور تنقید ۶۹

۷۔آزادی رائے اور معروضیت ۷۱

۸۔آزادی رائے کا عمومی کردار فکر کی وحدت میں ۷۳

فصل سوم: آزادی رائے اور فکری وحدت موجودہ اسلامی صورتحال میں ۷۷

۱۔آزادی رائے اور فکر اسلامی..... ۷۷
۲۔آزادی رائے اور ثقافتی وحدت..... ۸۷
۳۔آزادی رائے اور مسلکی وحدت..... ۹۱
۴۔آزادی رائے اور سیاسی وحدت..... ۹۴
۵۔آزادی رائے اور تحریکی وحدت..... ۹۶

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا اور اسے خلیفہ بنا کر زمین کے تمدن اور اس کی برکتوں کی افزائش کا امین اور اس میں حق وانصاف کے قیام کا ذمہ دار بنایا۔ کائنات کے لیل ونہار، شمس وقمر، زمین وآسمان، مویشی اور درخت، جانور اور نباتات، سمندر اور دریا غرض ہر چیز کو اس کے لئے مسخر کیا، اس کے ارادے کا پابند بنایا۔ اس کائنات سے اپنے مقاصد کے حصول کے لئے اس کو اس سے کشمکش یا اسے شکست دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ یہ سب اسی کی خاطر پیدا کیا گیا ہے اور اسی کے ارادے کے لئے مسخر کیا گیا ہے۔

اسے اس کائنات کی چیزوں کی افزائش کرنے اسے مسخر کرنے اور اس کے فائدوں کو سمیٹنے کی استعداد بھی دی گئی ہے۔ جبکہ کائنات کی تخلیق وایجاد کا ذمہ اللہ نے خود لیا ہے۔ وہی ہے جس نے ہر چیز کو خلقت دی اور ہدایت بھی کی۔ یہ اللہ کی کاریگری ہے جس نے ہر چیز کو بہترین طرز پر بنایا۔ امین اور خلیفہ کا منصب اسی کو سونپا جاسکتا ہے جو قدرت اور اختیار کا حامل ہو۔ چنانچہ انسان کو مختلف شکلوں اور نوعیّتوں کی قدرت سے نوازا گیا، اسے اختیار بھی دیا گیا، ورنہ ذمہ داری سونپنا فضول ہوتا، جو بے بس مجبور اور دوسرے کے ارادے کا پابند ہو اسے ایسی ذمہ داری دینا بے معنی ہے جس میں اسے اختیار نہ ہو، اگر وہ خواہی نخواہی کسی حکم کو نافذ کرتا ہے تو ایسی تنفیذ میں کون سی خوبی ہے۔

آزادی اسلام کے پیغام کا جوہر اور اس کے عقیدہ وشریعت کا محور ہے۔ اس دین کی اس خصوصیت کو مجبوروں، کمزوروں، دبے کچلے اور ستم رسیدہ لوگوں نے جان لیا تھا چنانچہ وہ پورے

دل ودماغ کے ساتھ اس کی طرف لپکے اور وہی اسلام کے اولین علمبردار تھے۔ دوسری طرف اہل جبر وغرور نے بھی اس حقیقت کو سمجھ لیا تھا اسی لئے انہوں نے اس دعوت کو جھٹلایا، اس کا مقابلہ کیا اور ہر طرح کی رکاوٹیں اس کے سامنے کھڑی کیں، انہوں نے اس کے خلاف ہر طرح کی جنگ کا اعلان کیا، مگر اللہ نے اپنے بندوں کی مدد کی اپنے لشکر کو غالب کیا اور تنہا ساری دشمن طاقتوں کو شکست دی۔

ایمان اپنے اسلامی دائرے میں عقل، وجدان اور انسانی ضمیر کی آزادی کا سب سے بڑا ذریعہ تھا۔ ایمان کے ذریعہ عقل کو تمام تر توہمات، جبر اور گمراہ کن راستوں سے آزادی ملی، وہ ایک آزاد غور وفکر اور تجزیہ واستدلال کے زیور سے آراستہ عقل ہوگئی جس کا معلومات کو قبول ورد کرنے میں بااصول اور فیصلہ کن منہاج تھا خواہ وہ زبانی روایت ہو یا تحریری عبارت ہو، سماعی ہو یا اجتہادی ہو، عالم غیب سے منسوب ہو یا عالم حضور سے، قابل قبول وہی بات ہوتی تھی جس کے حق میں دلیل وبرہان موجود ہو، معرفتوں کی ساری صورتیں بلا استثناء اس اصول کے تابع تھیں۔ بلکہ خود اللہ تعالی نے بہت سارے امور کو جنھیں خود اس نے مقدر کیا اور جن میں سے رسولوں کو بھیجنا بھی ہے دلیل وبرہان سے جوڑ دیا تا کہ اللہ کے خلاف لوگوں کے پاس کوئی حجت نہ رہے۔ انبیاء کو معجزات دئے تا کہ ان کے پاس لوگوں کو دکھانے کے لئے دلیل رہے جو ان کی نبوت پر دلالت کرے اور ان کے دعوے کی صداقت کو قوت بخشے۔

اسی طرح ایمان نے مومن کے وجدان اور اس کے ضمیر کو مکمل طور سے جبر کی ان تمام تر شکلوں سے ہمہ گیر آزادی عطا کی جو انسان کے ضمیر و وجدان کو مقید کر دیتی ہیں یا ان کی فعالیت کو مفلوج کر دیتی ہیں۔ کہ انسان اپنی تمام تر قوتوں کے ساتھ فکری، تمدنی اور تہذیبی فعالیت کے میدانوں میں قدم رکھے، اجتہاد کرے اور اس وجود میں خالق عظیم کی قدرت کے آثار کی نمائش میں تخلیقیت کا مظاہرہ کرے۔ اس لئے بھی کہ انسان کی توانائیاں اور اس کی اجتہادی اور تخلیقی

قوتیں اس وجود میں خلیفہ کی حیثیت سے ابھر کر آئیں، جس کے لئے اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو چیلنج کیا تھا اور اچھی طرح واضح کر دیا تھا کہ وہ ان سے زیادہ باصلاحیت اور زمین کی وراثت وخلافت کا ان سے زیادہ لائق ہے۔

{وعَلّم آدَمَ الأسْمَآءَ کُلّها ثمّ عَرضَهُم عَلی المَلٰئکَة فَقالَ أَنْبِئُونی بأَسْمآءِ هٰؤلآءِ اِن کُنتُم صٰدِقین۔قالُواْ سُبْحٰنَک لا عِلْمَ لنآ اِلّاماعَلَّمتَنآ اِنَّک أنتَ الْعَلِیمُ الحَکیمُ ۔قَال یاآدمُ أنْبئْهُم بأَسْمآ ئِهِم فلَمَّا أَنْبأَهُم بِأسْمآئِهِم قالَ أَلَمْ أَقُل لَّکُم اِنِّیٓ أَعلَمُ غَیبَ السَّمَوٰتِ والْأَرْضِ وأَعلمُ ما تُبدُونَ وماَ کُنْتُم تکْتُمُونَ﴾(البقرة : ۳۱-۳۳)

(اس کے بعد اللہ نے آدم کو ساری چیزوں کے نام سکھائے پھر انہیں فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور فرمایا اگر تمھارا خیال صحیح ہے (کہ کسی خلیفہ کے تقرر سے انتظام بگڑ جائے گا) تو ذرا ان چیزوں کے نام بتاؤ۔انہوں نے عرض کیا نقص سے پاک تو آپ ہی کی ذات ہے۔ہم تو بس اتنا ہی علم رکھتے ہیں جتنا آپ نے ہم کو دے دیا ہے۔حقیقت میں سب کچھ جاننے والا اور سمجھنے والا آپ کے سوا کوئی نہیں۔پھر اللہ نے آدم سے کہا: تم انہیں ان چیزوں کے نام بتاؤ جب اس نے ان کو ان سب کے نام بتا دئے تو اللہ نے فرمایا: میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ میں آسمانوں اور زمین کی وہ ساری حقیقتیں جانتا ہوں جو تم سے مخفی ہیں، جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو، وہ بھی مجھے معلوم ہے اور جو کچھ تم چھپاتے ہو اسے بھی میں جانتا ہوں)۔

اس طرح ایمان نے انسان کے ارادے کو آزادی سے نوازا اور اسلام نے اس آزادی کو تحفظ کی مطلوبہ ضمانتوں کا حصار دے دیا۔اب کسی کے لئے اس کی گنجائش نہیں تھی کہ اس کو اس کے ارادے کے علی الرغم مجبور کر دے۔اور جبکہ خدا بن بیٹھے ارباب غرور اکثر دین کو انسان کا ارادہ تباہ کرنے اور اس کی آزادی سلب کر لینے کا ذریعہ اور پردہ بناتے تھے۔اس دین وحید نے جو اللہ

کے نزدیک ہدایت کا دین اور آخری حق ہے صاف صاف اعلان کر دیا۔

{لآ اِكْرَاهَ فِي الدِّينِ قَد تَّبَيّنَ الرُّشْدُمنَ الغَيِّ....﴾(البقرة :٢٥٦)

(دین کے معاملے میں کوئی زبردستی نہیں صحیح بات غلط خیالات سے الگ چھانٹ کر رکھ دی گئی ہے)۔

انسان پختہ اور بالغ ہو چکا ہے وہ زندگی کے ابتدائی مرحلہ سے آگے بڑھ چکا ہے اب اسے ضرورت نہیں کہ کوئی بھی چیز جبر کی تلوار، دباؤ کے اوزار اور ڈراوے کے طریقوں سے قبول کرے جیسا کہ پہلے تھا:

{وَاِذْ نَتَقْنا الْجَبَل فوقَهُم كَأنَّهُ ظُلَّةٌوظَنُّوآ أنَّه وَاقِعٌبِهِم خُذُوأ مآءَ اتَيْنكُم بقُوَّة﴾(سورة الأعراف : ١٧١)

(وہ وقت بھی کچھ یاد ہے جب کہ ہم نے پہاڑ کو ہلا کر ان پر اس طرح چھادیا تھا کہ گویا وہ چھتری ہے اور یہ گمان کر رہے تھے کہ وہ ان پر آپڑے گا اور اس وقت ہم نے ان سے اس وقت کہا تھا کہ جو کتاب ہم تمہیں دے رہے ہیں اسے مضبوطی کے ساتھ تھامو)۔

﴿وَيَضَعُ عَنْهُمْ اصْرَهُم وَالأَغْلٰلَ الَّتِى كَانَتْ عَليهِمْ﴾(سورة الأعراف:١٥٧)

(اور ان پر سے وہ بوجھ اتارتا ہے جو ان پر لدے ہوئے تھے اور وہ بندشیں کھولتا ہے جن میں وہ جکڑے ہوئے تھے)۔

یہ طریقے رحمت کی شریعت کے ذریعہ منسوخ کر دئے گئے۔

''رائے اور اس کے اظہار کی آزادی'' کو اسلامی ایمان محض ایک حق قرار نہیں دیتا کہ انسان چاہے تو اس کا مطالبہ کرے اور چاہے تو اس سے دست بردار ہو جائے بلکہ یہ اس کا فرض ،ذمہ داری اور امانت ہے۔ یہ اس رکن کا حصہ ہے جسے بہت سارے علماء ارکان اسلام میں چھٹا

رکن قرار دیتے ہیں، یہ بہت نازک رکن ''امر بالمعروف اور نہی عن المنکر'' کا حصہ ہے۔ چنانچہ معاشرے میں کوئی برائی اور کوئی غلطی اگر ابھرتی ہے تو سارے لوگوں سے مطالبہ ہے کہ وہ اس سے ناپسندیدگی کا اظہار کریں۔ اسی طرح ان پر مشترک اور باہم مل کر ادا کرنے والی یہ ذمہ داری بھی عائد ہوگی کہ اس برائی کو مٹائیں اور انحراف کو درست کریں۔ ہر ایک اپنی طاقت کے حدود اور اپنے کام اور سرگرمی کے دائرے میں اس کا مکلّف ہے۔ اس میں کوئی فرق نہیں ہے کہ یہ غلطی یا انحراف دین کے فہم سے متعلق کسی مسئلہ میں ہے یا سماج کے کسی مسئلے میں۔ اس میں بھی فرق نہیں ہے کہ انحراف چوٹی پر ظاہر ہوا ہے یا بنیاد میں۔ بلکہ حکام، اعلیٰ قیادت اور سماج کے فیصلہ ساز لوگوں کے انحراف کے خلاف آواز بلند کرنے کی زیادہ حوصلہ افزائی اور زیادہ ترغیب ملتی ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: شہیدو ں کے سردار (قیامت کے دن) حمزہ بن عبدالمطلب اور وہ آدمی ہوگا جو ظالم سلطان کے سامنے کھڑا ہوا، بھلائی کا حکم دیا اور برائی سے روکا اور اس پر اس نے اسے قتل کر دیا۔ (مسند ابی حنیفہ ص ۱۳۳) ''افضل جہاد ظالم سلطان کے سامنے حق بات کہنا ہے'' (سنن ابی داود) اس صحیح حدیث میں امت کے لئے ترغیب ہے کہ وہ رائے کی آزادی، اس کے اظہار کی آزادی اور منکر کی مخالفت کے سلسلے میں اپنا حق نہیں بلکہ اپنی ذمہ داری کو ادا کرتی رہے، چاہے شروع میں اس کے لئے کچھ قربانیاں دینی پڑیں اور ظالموں اور جابروں کے ہاتھوں کچھ لوگ شہادت کا جام نوش کریں۔ یہ ظالم چاہتے ہیں کہ لوگوں کو تہذیب کی تعمیر میں ان کے حقیقی رول کی ادائیگی سے روک دیں اور انہیں سماج کا انحراف درست نہیں کرنے دیں۔

آزادی کے یہ تصورات اسلام کے دور اول میں حکومت اور رعایا سب میں عام اور معروف تھے۔ عمر بن خطابؓ کے پاس جب ایک قبطی فاتح مصر اور اس کے گورنر عمرو بن العاص اور ان کے لڑکے کی شکایت لے کر پہونچا اور جب خلیفہ عادل نے دونوں سے بدلہ اور اسے

انصاف دے کر راضی کر دیا تو یہ عظیم اعلان کیا: تم نے کب سے لوگوں کو غلام بنالیا، انہیں تو ان کی ماؤں نے آزاد جنا تھا۔ حضرت علی کرم اللہ وجہ سے بھی یہ قول روایت کیا گیا ہے: اے لوگو آدم سے نہ غلام پیدا ہوا تھا نہ لونڈی بلاشبہ سب لوگ آزاد ہیں (نہج السعادۃ ج ا ص ۱۹۸)۔ اہمیت کے کسی بھی درجے کا کوئی اہم معاملہ ہوتا تھا تو پوری امت کو اپنی رائے بیان کرنے کی دعوت دی جاتی تھی۔ چرواہوں سے ان کی چراگاہوں میں مشورے لئے جاتے تھے اور پردہ نشینوں سے ان کے پردے میں۔ اور جب ایک مسلمان حضرت عمرؓ کی کسی بات پر اعتراض کرتا ہوا آیا جو اس کے سامنے واضح نہیں ہوسکی تھی۔ اور اس نے اعتراض میں شدت کا مظاہرہ کیا اور مجلس کے کچھ لوگوں نے اسے خاموش کر کے وہاں سے ہٹانا چاہا تو حضرت عمرؓ نے روک دیا اور کہا: اسے کہنے دو، تم اگر ایسی باتیں نہیں کہو گے تو مانو تم میں کوئی خیر نہیں ہے اور ہم انہیں نہیں سنیں گے تو مانو ہم خیر سے خالی ہیں۔

ربعی بن عامر سے جب رستم نے جہاد کے لئے نکلنے کا سبب پوچھا تو انہوں نے جواب دیا تھا'' ہمیں تو اللہ نے بھیجا ہے تا کہ ہم جسے وہ چاہے اس کو بندوں کی غلامی سے نکال کر اللہ وحدہ کی بندگی میں، مذاہب کے ظلم سے اسلام کے عدل اور دنیا کی تنگی سے دنیا و آخرت کی وسعت میں داخل کریں۔ گویا ضمیر، وجدان، ارادہ، تعبیر اور تحریک ہر پہلو سے انسان کی آزادی اور ان ساری آزادیوں کی حفاظت ان کا دفاع اور ان کی دیکھ بھال اسلام کے اہداف اور اسلامی جہاد کے مقاصد کا جوہر اصلی ہے۔

اور اگر اللہ تعالیٰ کے حکم سے خلافت راشدہ اور لمبے وقت تک چلتی رہتی اور اسے موقعہ ملا ہوتا کہ وہ ایسے چینلز بنائے جو ان آزادیوں کو منظّم کریں اور ان کی حفاظت کی ضمانت لیں تو ایسی صورت میں امت پر پسپائی کے وہ اسباب مسلط نہ ہوتے جنھوں نے اسے ایسی امت سے جو لوگوں کے سامنے لائی گئی تھی تا کہ نمونہ اور شہادت کے منصب پر رہے اس امت میں تبدیل

کر دیا جو اپنے تہذیبی کردار سے بھی پیچھے ہٹتی جا رہی ہے۔ وہ امت جو اس کے بعد اللہ کے بندوں کی آزادی غصب کرنے والے ظالموں اور جابروں کی پیدائش کی عادی ہوگئی۔ جب سے خلافت راشدہ کا پرچم اتار دیا گیا ابھی تک وہ ایسے لوگوں کے غول در غول جنے جا رہی ہے۔ کوئی شک نہیں ہے کہ خلافت راشدہ کی کم عمری اور کچھ لوگوں کی بادشاہت سازی میں جلد بازی نے بہت سارے بنیادی اسلامی تصورات کے سکڑ جانے میں رول ادا کیا۔ جن میں ''آزادی اپنی مختلف شکلوں میں'' بھی ہے۔ بلکہ مسلمانوں کے درمیان ایسا فکری اور ثقافتی ترکہ بھی وجود میں آ گیا جو مقدار میں کم نہیں ہے اور جو ان انحرافات کو بنیاد فراہم کرتا ہے اور آزادیوں کی مختلف شکلوں کو محدود یا ختم کر دیتا ہے۔ یہ غیر صحتمند فکری ورثہ ہے جس کو اختیار کرنا بھی جائز نہیں ہے چہ جائیکہ کوئی اس پر فخر کرے، اس کا دفاع کرے یا اس کو عام کرے اور اسے اسلام کی تعلیمات اور اس کی بنیادی قدروں میں شمار کرے۔ شاید اسی ترکے میں سے وہ کچھ بھی ہے جو ''سد الذرائع'' اور ''الأخذ بالاحتیاط أولأ حوط'' کے قاعدوں کے تحت ذکر کیا گیا ہے۔ لوگوں نے ان دونوں قاعدوں یا اصولوں کو سمجھنے میں بہت غلطی کی ہے۔ خاص طور سے ظالم حکومتوں نے ان کا بہت زیادہ غلط استعمال کیا ہے۔ جب انہوں نے ان دونوں قاعدوں کو ان کے دائرے اور ان کے بہت محدود اور مخصوص فقہی میدان سے منتقل کر کے انہیں دو فکری بنیادیں بنا ڈالا، جو امت کے دماغی سفر کو کنٹرول کرتے ہیں، اور اس کی تمام تر تفصیلات پر فیصلہ کن ہوتے ہیں اور ان کو امت کے دماغ کی نگرانی کا حق دیتے ہیں کہ اس کی زبانوں کو گونگے آلات بنا دیں جن میں تنہا ایک ظالم اور ضرورت کا تقاضا ہو تو اس کے حاشیہ برداروں کی بھی حمد و تسبیح کا پروگرام لوڈ کر دیا گیا ہو۔ ظالموں اور ان کے حاشیہ برداروں نے ہمیشہ امت کو ایک پاگل یا یتیم بچے کی حیثیت سے دیکھا ہے جو چونکہ یہ نہیں جانتی کہ اس کا فائدہ یا نقصان کس میں ہے، اس لئے اس کا ایک ولی ہونا ضروری ہے جو اسکی ضرورتوں اور مسائل کو سمجھے اور ان کا انتظام کرے۔ اور یہ ظالم و جابر ہی اس ذمہ داری کو رضا کارانہ طور پر

اٹھائیں اور ولایت ونگرانی کا کام انجام دیں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وحی الٰہی نے اعلان کیا ہے کہ یہ امت ضلالت پر جمع ہونے سے محفوظ ہے اور غلطی پر جمع ہوجانے سے بھی بچالی گئی ہے۔ اور اگر وہ غلطی کرے گی بھی تو ان ظالم وجابر آمروں جیسی غلطی ہرگز نہیں کرے گی۔ وحی نے یہ اعلان بھی کیا کہ امت سے بے نیازی اس کے ارادے اور خواہش سے تجاہل اور اس کی خیر خواہی اور اسے مشورے میں شریک کرنے سے اعراض استبداد اور سرکشی کا اہم ترین دروازہ ہے۔

﴿كَلَّآ اِنَّ الانْسَنَ لَيَطْغَىٓ۔ أن رَّءَ اهُ اسْتَغْنَىٓ﴾ (سورة العلق : ۶-۷)

(ہرگز نہیں، انسان سرکشی کرتا ہے اس بنا پر کہ وہ اپنے آپ کو بے نیاز دیکھتا ہے)

اگر ''رائے اور اسکے اظہار کی آزادی'' مسلمانوں کی زندگی میں فکر وعمل کا ایک مضبوط ستون بن کر رہتی جیسا کہ رسول اللہ ﷺ اور خلفاء راشدین کے زمانے میں تھا تو امت کو پے در پے ہزیمتوں کا منہ نہیں دیکھنا پڑتا اور آج ہماری امت پستی کے اس گہرے کھڈ میں نہیں ہوتی۔

اس امت میں اصلاح کی بہت ساری کوششوں کو ناکام بنا دیا گیا۔ ان کوششوں کے اثرات کو مقید کرکے امراض کے ایک مجموعے کے ذریعہ تباہ کردیا گیا۔ ان امراض میں فکری بحران ،ثقافتی غیر حاضری، سیاسی جبر، خودشناسی کا فقدان بھی ہیں، تاہم ''صحتمند پختہ دماغ کی غیر موجودگی اور اگر وہ موجود بھی ہوتو اسے فعال ہونے سے روکنے کی ہر وسیلے سے کوشش'' کا مسئلہ پسپائی کے اسباب، غلطی کے محرکات اور خلل کی وجوہات میں سرفہرست ہے۔

پختہ دماغ سے محرومی کا معاملہ بے حد نازک ہے۔ پختہ دماغ ایسی امت میں کیسے جنم لے سکتا ہے جس امت کے سارے امکانات کو عقل کے محاصرے اور اسکی تحقیر پر، ذہن کا دائرہ تنگ کرنے اور فکر کا مذاق اڑانے پر اور تقلید اور تابعداری کے اسباب کو پیدا کرنے اور ان کا ڈھیر لگانے پر مامور کردیا گیا ہو۔ یہ چیز نظام ہائے حکومت تک محدود نہیں رہی بلکہ یہ ان گروہوں تنظیموں اداروں اور جماعتوں تک سرایت کرگئی جنھیں اس امید کے ساتھ قائم کیا گیا تھا کہ وہ

امت کو اس حالت زار سے نکالنے اور اس بحران سے گذارنے میں معاون ہوں گی ۔ جو امت کے صالح عناصر کی پرورش کی بہترین آغوش بنیں گی ۔ مگر ہوا یہ کہ وہ بھی یہی کام ''نافذ کرو پھر بحث کرو'' کے اعلان کے تحت کرنے لگیں یہاں تک کہ اسلامی جماعتیں اور تنظیمیں بھی اس سے محفوظ نہ رہیں کہ کسی کی رائے کو روکیں یا رد کر کے اس پر پابندی لگا دیں یا حسب ضرورت اس رائے رکھنے والے کو تنظیم سے الگ کر دیں، اس کی کتابوں کو برسر حق گروہ یا مدد خداوندی کی مستحق جماعت میں گردش کرنے سے روک دیں۔ اس کے لئے مختلف دلیلیں بھی دے دی جاتی ہیں جیسے یہ کہ امیر کی اطاعت واجب ہے یا یہ کہ امیر ڈسٹرب نہ ہو۔ ان لوگوں نے وہ سب کچھ جو ہمارے فقہی ورثے میں تھا اور بادشاہت اور جبر کے زمانوں کی پیداوار تھا اسے تحریک یا تنظیم کے امیر کی گود میں لا کر ڈال دیا تا کہ اس کے پاس شرعی وسائل، ماضی کے ہتھیار اور سرکوبی کرنے کے وہ اختیارات رہیں جو شورائیت کو روک سکیں۔ دوسرے کی رائے اور اس کے اظہار کے سامنے دیوار بن جائیں تا کہ جماعت کا امیر یا تنظیم کا قائد ظالم حاکموں کی جانشینی کا مستحق ہو سکے مگر ''اللہ کی حاکمیت'' کے نعرے کے ساتھ۔ بلکہ یہ وبا ہمارے گھروں اور خاندانوں تک پہونچ گئی۔ گھر کا بڑا گھر کا آقا بنا ہوا ہے۔ اسکی بات گھر میں چلتی ہے۔ اس کے سامنے کوئی ہونٹوں کو جنبش دینے کا بھی حق نہیں رکھتا، (یہ بھی جاننا چاہئے کہ آج مسلم خاندان کے ذمہ دار کی حیثیت رہائشی ہوٹل یا ریسٹورنٹ کے منیجر کے رول سے زیادہ نہیں رہ گئی ہے۔ اس کے پاس اپنے بچوں کو دینے کے لئے اتنا وقت نہیں ہے جو انہیں خاندان کے مفہوم سے آشنا کرے)۔ غرض استبداد اور دوسرے کی رائے کو ٹھکرانا بلکہ جڑ سے اکھاڑنے اور سماج کے وجود اور اس کے خلیوں میں اس کی موجودگی کو روکنے کا سلسلہ بڑھتا گیا یہاں تک کہ امت میں ''عوامی ذہن، مویشیوں کا مزاج اور غلاموں کی نفسیات'' کا انبار لگ گیا۔

استبداد نے اس امت کو اس حالت تک کیسے پہونچا دیا؟ جبکہ یہ وہ امت ہے جس کے

قدیم افراد یعنی اصول فقہ کے علماء نے ''رائے'' کو شریعت کی ایک دلیل قرار دیا تھا۔یعنی معتبر شرعی ذریعوں سے رائے جس نتیجہ تک پہونچائے وہ لوگوں کے یہاں شریعت کی طرح لائق عبادت ہوتا تھا پھر دیکھتے ہی دیکھتے بعد والوں کے یہاں وہ بدعت، جرم، انحراف، اعتزال، سنت سے بغاوت، اطاعت سے دوری غرض وہ کچھ ہوگیا کہ کچھ لوگ امت کی فضا کو اس سے پاک کرنے اور اس سے محفوظ رکھنے کی دہائی دینے لگے۔اسے ایسی گمراہی قرار دینے لگے جس سے لوگوں کو ہوشیار کرنا فرض ہو اور ایسا دروازہ جسے بند کرنا واجب ہوتا کہ امت پر شر کے وہ دروازے نہیں کھل جائیں جو بند نہیں ہوسکیں، غرض سوچنے کا عمل رک گیا۔اور یہ سمجھا گیا کہ غور وفکر اور نئی رائے جنم دینے سے رک جانا ہی اس کی بہتر ضمانت ہے کہ ٹھہرے ہوئے ساکن افکار کا مجموعہ امت پر حکمراں رہے اس کے دماغ پر حاوی رہے اور حسب ضرورت اس کو بار بار پیدا کیا جاتا رہے۔میری عمر کی قسم اس کے بعد بھی امت پر شر کا کون سا دروازہ ہے جو نہیں کھلا؟ ساری برائیاں خدا کی پناہ اس امت کی زندگی میں ہر جانب سے داخل ہو رہی ہیں کھلے دروازے تنگ پڑتے ہیں تو کھڑکیوں سے شر گھسا جاتا ہے۔اس کا ذمہ دار کون ہے؟ بہت مختصر لفظوں میں ظالموں کا استبداد، عالموں کی بے بسی اور ابنائے امت کی جہالت، نہ کہ رائے کا اظہار اور اس کے اظہار کی آزادی۔

ظالموں کے استبداد کے اثرات اور خطرے جانے پہچانے ہیں۔قرآن اور احادیث نبوی جو اس سے خبردار کرتی ہیں وہ بھی معروف ہیں۔قرآن مجید کی کسی سورت کی تلاوت کریں وہ پوری شدت سے استبداد اور سرکشی سے اور تہذیبوں کی تباہی، قوموں کی پسپائی اور کائنات کی بربادی میں ان کے اثرات سے متنبہ کرتی ہے۔رسول اللہ ﷺ کی سنت بھی ایسی ہدایات سے بھرپور ہے جو استبداد اور سرکشی سے ڈراتی ہیں۔اس کے مقابلے اور اس کے سد باب کیلئے سارے وسائل اور ساری توانائیاں صرف کردینے کو واجب کرتی ہیں۔رسول اللہ ﷺ اپنے

صحابہ کو پختہ رائے سازی اور اظہار رائے کے تمام تر وسائل کی تعلیم دینے میں نمونہ اور ماڈل ہیں۔ آپ ﷺ سے جو بھی ،صحابہ کے ساتھ آپ کی مشاورت ،مراجعت اور گفتگو نیز اپنی موجودگی اور غیر موجودگی میں اجتہاد کی ترغیب کے سلسلے میں روایت کیا گیا ہے وہ اس پر دلیل ہے۔ اور باوجود اس کے کہ آپ ﷺ اس روئے زمین پر سب سے مضبوط دماغ ، پاکیزہ ترین عقل اور روشن ترین فکر کے حامل انسان تھے مگر وہ شوری سے نہ غفلت برتتے تھے نہ ہی اسے تجاوز کرتے تھے ،نہ بڑے معاملات میں اور نہ ہی معمولی چیزوں میں۔ وہ معصوم تھے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے انہیں درست رائے اختیار کرنے کی توفیق ملی ہوئی تھی ،وحی سے ان کا رشتہ اتصال تھا، پھر بھی وہ ساتھیوں سے مشورہ کرتے تھے۔ ان سے اپنی رائے ظاہر کرنے کا مطالبہ کرتے تھے۔ اس پر ان سے بڑے اجر اور ثواب کا وعدہ کرتے تھے۔ یہ بھی واضح کرتے تھے کہ دنیا کے اور اپنے ذاتی امور کے بارے میں وہ خود زیادہ جاننے والے ہیں۔ بسا اوقات وحی کی موجودہ صورتحال پر تطبیق کرتے ہوئے اور ہمیشہ ان چیزوں میں جن میں وحی نازل نہیں ہوئی ان کا مشورہ مانتے تھے جبکہ اگر کسی انسان کے لئے جائز ہوتا کہ وہ شوری سے بے نیاز ہو یا اسے یہ حق ہوتا کہ مشورے کو قبول نہ کرے ،اپنی رائے سے دستبردار نہ ہو اور شوری کو محض مختلف رایوں سے آگاہی کا درجہ دے تو یہ صرف رسول اللہ ﷺ کے لئے درست ہوتا اور وہی اس کے سزاوار بھی تھے کیونکہ وہ معصوم تھے اور استبداد جیسی غلطی سے وہ منزہ اور پاک تھے۔ اللہ تعالیٰ نے تو اس کی تاکید کی ہے، اس کا حکم دیا ہے۔ شارع کا حکم فرضیت بتاتا ہے۔ اللہ نے اپنے رسول کو مشاورت میں لاپرواہی اور اسے تجاوز کرنے جیسی خامی سے محفوظ و معصوم بنایا تھا۔

اور جب معرکہ احد کیلئے مدینہ سے نکلنے کے مسئلے میں شورائی فیصلے کے منفی نتائج سامنے آئے اور مسلمان دوسرے مرحلے میں گھاٹے میں رہے اور اندیشہ ہوا کہ شورائیت کی رسوائی ہوگی یا اس کی پابندی میں ضعف آجائے گا۔ قرآن مجید نے آکر شورائیت کی قطعی حکم کے ذریعہ تاکید کی

اور رسول اللہ ﷺ کے عزم کو اس پر مرتب قرار دیا۔

﴿وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ﴾(آل عمران: ۱۵۹)

(ان سے معاملے میں مشورہ کرو (اور مشورے اور کسی واضح رائے تک پہونچنے کے بعد) جب عزم کرلو تو اللہ پر بھروسہ کرو)۔

کسی فیصلہ کا عزم شورائیت کے بعد اور اسی پر منتج ہو۔ مشاورت عزم کے لئے مقدمہ، سبب اور علت ہے اس لئے یہ کہنا درست نہیں ہے کہ وہ آگاہی کا ذریعہ ہے اس کی پابندی ضروری نہیں ہے اور جب اللہ کے رسول ﷺ کو اس کا پابند بنایا گیا تو دوسروں کو پابند بنانا تو بدرجہ اولی ثابت ہوتا ہے۔ رائے کی آزادی اور اس کے اظہار کی آزادی وہ بنیاد ہے جس پر شورائیت قائم ہوتی ہے وہ شورائیت کے لئے ناگزیر ضرورت ہے جس کے بغیر شوری کا وجود ممکن نہیں ہے۔ اصولیوں کے الفاظ میں یہ اس قبیل سے ہے کہ ''واجب مطلق جس کے بغیر پورا نہیں ہو اور وہ مکلّف کے مقدور میں ہو تو وہ بھی واجب ہے۔''

اس کے باوجود اس امت میں سرکشوں کا استبداد جاری رہا ان کی افزائش نسل کثرت سے ہوتی رہی، اور وہ امت میں اس طرح پھیل گئے کہ تاریخ کے بہت سارے مراحل میں اس کی دین ودنیا سب بگاڑ دی۔ ان کی مدد خوشامدی علماء کے ان گروہوں نے کی جنھیں علم سے بھی اللہ کی وہ خشیت حاصل نہ ہوسکی جو انہیں ظالموں کی طرف جھکنے، ظلم کو خوبصورت لبادہ پہنانے اور محض اس لئے کہ استبداد اور اہل استبداد کے لئے میدان صاف ہوجائے، قرآن وحدیث کی عبارتوں کو شکستگی کی حد تک موڑ دینے سے روکتی۔ کسی نے فتوی دیا کہ شورائیت ذریعہ آگاہی ہے وجہ پابندی نہیں ہے۔ کسی نے اس پر قیاس کر کے کہ رسول اللہ ﷺ نے شیخین ابوبکر وعمر کے ساتھ مشورہ کیا تھا فتوی دیا کہ شوری دولوگوں سے مشورہ کر کے بھی ہوجاتی ہے۔ کسی نے کہا کہ تین کے ساتھ مشاورت کافی ہے کیونکہ یہ اقل جمع ہے۔ بعض نے جو پچھلی شریعت کے حجت ہونے کے قائل تھے

کہا کہ فقط بارہ افراد سے مشورہ کافی ہے جنہیں سلطان خود متعین کرے گا۔ دلیل اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: {اثْنَیْ عَشَرَ نَقِیْباً﴾ (سورۃ المائدۃ: ۱۲) (اوران میں بارہ نقیب)۔ جبکہ یہ بھی لوگوں نے کہا کہ بیعت عقبہ اولی میں بیعت کرنے والوں کی تعداد سے شوری کی تعداد نہیں بڑھنا چاہئے۔ غرض وہ بہت سارے اقوال جن کی پشت پر کوئی معتبر دلیل موجود نہیں ہے۔

پھر ''فتنہ کے دروازے بند کرنے'' اور ''انتشار کے راستے مسدود کرنے'' کو بنیاد بنا کر جسے غلبہ حاصل ہو جائے اس کی امامت کو شرعی سند سے نواز دیا گیا۔ اس طرح ہماری تاریخ کے بہت ابتدائی زمانے سے ظالموں اور جابروں کی حکومت بھی شرعی ہوگئی اور ان کے احکام بھی شرعا نافذ ہونے لگے۔ یوں اس کے لئے بھی امت تیار ہو چکی تھی کہ فوجی اور عسکری انقلابات کے احکام قبول کرے، یا ان عناصر کے جو ہر حربہ سے انہیں یک رائے کرنے کی قوت رکھتے ہوں۔

ان احوال کی مخالفت بہت ہی قلیل تعداد میں علماء صالحین نے کی اور بہت دھیمی آواز میں جس پر اکثر و بیشتر کان ہی نہیں دھرا گیا۔

غرض سد ذرائع اور أخذ بالأحوط کی تیغ وتفنگ کے سائے میں ہماری امت نے مستقل مارشل لاء اور ایمرجنسی قانون کے سائے میں زندگی گذاری۔ خلافت راشدہ کے خلاف باغیانہ انقلاب کے بعد سے ہی اس کے سیاسی نظام کی بنیادیں معطل ہوگئیں۔ ظلم وجبر اور بزور غلبہ پر یقین رکھنے والے خلفاء اور سلاطین نے اسلام کا صرف نظام قضا محفوظ چھوڑا تا کہ بہت سے احوال میں جب کہ ان کے اقتدار کو کوئی نقصان نہیں پہونچ رہا ہو امت کی بعض ضرورتوں کی حفاظت کے لئے وہ بنیادی ضمانت کا کام دے۔ یہ نظام بھی غلط استعمال اور انحراف سے دوچار کر دینے کی کوششوں سے محفوظ نہیں رہتا، اگر خدا ترس علماء اس کی حفاظت ومدافعت کے لئے بیدار نہیں رہتے۔ اس کے باوجود بعض سرکشوں نے جب بھی ان کے لئے ممکن ہوا اسے مخالفین کی سرکوبی کا ذریعہ بنا ڈالا۔ ارتداد اور محاربۃ کے نام سے بعض مخالفین کو قتل کیا گیا تو بہت سارے

سیاسی مخالفین پر شریعت کی مخالفت اور دین سے بغاوت کا ٹھپہ لگایا گیا تا کہ مخالف کو امت کی ہمدردی یا حمایت سے محروم کر دینا آسان ہو جائے ۔ گو کہ بعض علماء نے ظالم و جابر سلاطین کے سلسلے میں خاموشی کو ''امت کی وحدت کی حفاظت'' کی دلیل دے کر جائز بنا دیا مگر وہ استبداد ظلم اور سرکشی جسے ان ڈکٹیٹروں نے قدیم وجدید ہر دور میں اپنایا۔ اس نے بھی تو امت میں تفرقہ ڈالا اس کی وحدت کو پارہ پارہ کیا اور اسے گروہوں میں بانٹ دیا۔ ان آمروں نے انہیں باہم ٹکرانے کیلئے آپس میں تقسیم کر لیا۔ اس طرح استبداد اور لوگوں کی غور وفکر اور اظہار کے حق سے محرومی کا نتیجہ یہ ہوا کہ امت کی ساری دیواریں زمین بوس ہو گئیں اور وہ بنیادی ضرورتوں سے محروم کر دی گئی۔

ان مسائل کا تیسرا ذمہ دار امت کے افراد کا ان امور سے ناواقف ہونا یا بہت سے لوگوں کا ان سے تجاہل برتنا یا قصداً اندھیرے میں رکھے جانے کے عمل کو قبول کر لینا ہے تا کہ ان ڈکٹیٹروں اور ان کے حاشیہ بردار اہل علم وقلم کے پیچھے پیچھے چلنے کا عمل آسان ہو جائے ۔ یہ جہالت تیسرا بت ہے۔ بتوں کا یہ غیر مقدس تکون ہے۔ سرکشوں کا جبر، علماء کی بے بسی اور ابنائے امت کی جہالت۔

سرکش فرعون نے جب اپنی قوم سے أَنَا رَبُّكُمُ الْأَعْلَىٰ کہا تھا اس وقت اسے عوام کی غفلت ،ان کی غیر مشروط اطاعت اور اندھی غلامی سے دھوکا ہوا تھا۔ سرکشوں کو عوامی غفلت واطاعت جیسی کوئی بھی چیز دھوکے میں نہیں رکھتی ہے۔ سرکش حکمراں محض ایک فرد ہوتا ہے جس کے پاس درحقیقت نہ طاقت ہوتی ہے نہ اقتدار ۔ یہ تو غافل اور پالتو عوام ہیں جو اپنی پیٹھ بڑھا دیتے ہیں تو وہ سوار ہو جاتا ہے گردن پھیلا دیتے ہیں تو وہ لگام ڈال دیتا ہے۔ سر جھکا دیتے ہیں تو وہ مغرور ہو جاتا ہے اور عزت وسربلندی کے اپنے حق سے دست بردار ہو جاتے ہیں تو وہ سرکش ہو جاتا ہے۔

عوام ایسا اس لئے کرتے ہیں کیونکہ انہیں ایک طرف تو دھوکہ ہوتا ہے دوسری طرف

خوف ۔ یہ خوف بھی محض وہم کا نتیجہ ہوتا ہے ،سرکش حاکم ایک فرد کی حیثیت سے لاکھوں اور کروڑوں سے طاقتور نہیں ہوسکتا ہے اگر انہیں اپنی انسانیت عزت وغیرت اور آزادی کا شعور ہوجائے ۔ طاقت کے لحاظ سے تو امت کا ہر فرد سرکش حاکم کے برابر ہوتا ہے ،مگر یہ سرکش انہیں دھوکہ دیتا ہے ۔اور دل میں وہم ڈال دیتا ہے کہ ان کے نفع نقصان کا اختیار اس کے پاس ہے ۔ ایک فرد یا افراد کا کوئی ٹولہ کسی باعزت امت پر زیادتی کرلے یہ کبھی ممکن نہیں ہے ۔اور یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ کوئی فرد یا ٹولہ ایسی امت پر زیادتی کرے جو اپنے رب کو پہچانتی ہو اور اس پر ایمان رکھتی ہو اور جو غلامی قبول کرنے سے انکار کردے کسی بھی مخلوق فرد کی جو نہ اپنے اور نہ اس کے نفع یا نقصان کا اختیار رکھتا ہے ۔

مگر سرکش حاکم اپنی قوم کو لالچ اور دھمکی کے مختلف حربوں سے بیوقوف بناتا ہے ۔وہ اپنی بداعمالی اور گمراہی کے باعث اس کی بات مان لیتے ہیں ۔ یہ سرکش پہلے تو عوام کو علم کے راستوں سے دور کردیتے ہیں اور ان سے حقائق کو چھپادیتے ہیں یہاں تک کہ وہ انہیں بھول جاتے ہیں اور دوبارہ اس کی تلاش بھی نہیں کرتے پھر ان کے دلوں میں جس طرح کے نقوش چاہتے ہیں ثبت کردیتے ہیں یہاں تک کہ ان کے دل ان بناوٹی نقوش سے مانوس ہوجاتے ہیں ۔ پھر سرکشوں کے لئے عوام کو بیوقوف بنانا اور ان کی بھیڑ کو اپنے پیچھے لے کر چلنا آسان ہوجاتا ہے ۔عوام کی لگام نرم ہوجاتی ہے اور سرکش حاکم پورے اطمینان کے ساتھ انہیں جس رخ پر چاہتے ہیں ہانک لے جاتے ہیں ۔

یہ سرکش حکمراں اپنے عوام کے ساتھ یہ حرکت جبھی کرسکتے ہیں جب عوام فسق وفجور میں مبتلا ہوں ، جادہ مستقیم سے بھٹک جائیں ،اللہ کی رسی کو چھوڑ دیں ،ایمان کے پیمانوں کو نظر انداز کردیں اور ان کے لئے فیصلے کا مرجع نہ قرآن ہو نہ دلیل و برہان ہو ۔

جبکہ خداترس مومنوں کو دھوکہ دینا ،انہیں بیوقوف بنانا اور ہوا میں اڑتے ہوئے پر کی

طرح ان سے کھلواڑ کرنا مشکل ہوتا ہے۔یہیں سے قرآن مجید بتاتا ہے کہ عوام نے فرعون کی بات مان کیوں لی تھی؟۔

﴿فَاسْتَخَفَّ قَومَهُ فأَطَاعُوهُ اِنَّهُم كانُواْ قَوماً فٰسِقِينَ﴾(سورة الزخرف: ۵۴)

(اسنے اپنی قوم کو ہلکا سمجھا اور انہوں نے اس کی اطاعت کی، درحقیقت وہ تھے ہی فاسق لوگ)۔

سوچیئے !اگر علماء ومفکرین، اہل قلم اور ارباب تربیت نے اپنی ذمہ داری ادا کی ہوتی فسق وفجور کا مقابلہ کیا ہوتا اور تقوی کو رواج دیا ہوتا تو کیا یہ سرکش امت کا استخفاف کر پاتے اس کی عقلوں کو کند کر کے اسے تباہی کی طرف گھسیٹ کر لے جا پاتے؟نہیں ہزار بار نہیں۔

سوچیئے اگر علماء امت نے (میری مواد صرف فقہاء نہیں بلکہ ہر میدان کے ماہرین علوم اور سرفہرست علماء دین ہیں) اپنی ذمہ داریوں کو سمجھا ہوتا۔فسق وفجور کی ساری شکلوں کا تصور، فکر، اعتقاد، رویہ، معاملات اور عمل کی سطح پر مقابلہ کیا ہوتا تو یہ سب کچھ ہوتا؟ کیا لوگ فسق وفجور سے متصف ہوتے اور کیا یہ سرکش ان کی گردنوں پر سوار ہو پاتے؟نہیں۔

اگر علماء نے امت کو سمجھایا ہوتا کہ یہ سرکش حاکم خدائی کا دعویدار ہے لوگوں کو اپنے حال اور اپنی حرکتوں کی زبان سے یا انجام کے حوالے سے بلا رہا ہے کہ اسے اللہ کی خدائی میں شریک بنالیں۔اور یہ بتایا ہوتا کہ جابر کے سلسلے میں خاموشی یا جبر پر رضامندی یا شوری کو معطل کرنا شرک ہے جو توحید کے منافی ہے۔اور یہ کہ اللہ نہ جابر سے کوئی نیکی قبول کرتا ہے نہ جبر پر راضی ہونے والے سے خواہ وہ اسلام کا دعوی کرے اور نماز روزہ کا پابند ہو۔اگر انہوں نے یہ کیا ہوتا تو کیا امت استبداد کے سامنے خاموش رہتی اور کیا وہ کسی صاحب استبداد کو اپنا استخفاف کرنے اور اپنے معاملات کا مختار کل بننے دیتی؟۔

کاش امت کے عالموں، مفکروں، مصنفوں، خطیبوں اور داعیوں نے امت کو اس کے حقوق اس کے واجبات اور اس کے جسم میں خیر وشر کے دروازوں کی تعلیم کا اتنا ہی اہتمام کیا ہوتا جتنا اہتمام طہارت کی تفصیلات، نماز کے طریقہ، رسول اللہ ﷺ کو سیدنا سے ملقب کرنے کی کراہت اور ان کے ذکر کے وقت کھڑے ہونے کی کراہت وغیرہ کی تعلیم کا کیا جاتا ہے۔ تب بھی امت کی حالت بدل جاتی اور اس کے شعور کا درجہ بلند ہو جاتا۔

کاش انہوں نے امت کو سکھایا ہوتا کہ ایسے فرد کی تعظیم وتائید اس کے حق میں نعرے بازی اور اسکی خدمت ومعاونت جو اللہ کے شعائر کی تعظیم نہ کرے ظلم ہے۔ اور ظلم قیامت کے دن کی تاریکیاں ہے۔ یہ تقوی سے دوری ہے اور جو تقوی سے دور ہو جاتا ہے فسق میں گر پڑتا ہے۔ پھر شرک تک جا پہونچتا ہے اور بلا شبہ شرک بڑا ظلم ہے۔ کاش انہوں نے سکھایا ہوتا کہ امت کے حکام دراصل امت کے خدام وملازمین ہیں۔ اگر وہ امت کی خدمت میں غلط روش اپناتے ہیں تو امت پر واجب ہے کہ انہیں تبدیل کر دیں۔

کاش انہوں نے امت کو یہ سبق بھی پڑھایا ہوتا کہ حکومت اعزاز نہیں ذمہ داری ہے، سیاست امت کے اور پوری امت کے مفادات کی نگہداشت اور ان کی خدمت ہے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر شرعی فرائض ہیں جو ہر فرد پر عائد ہوتے ہیں، یہ امتی ذمہ داری ہے جس سے یا جس کی انجام دہی کے حق سے کوئی دست بردار نہیں ہوسکتا۔ امت کی ثروتوں کو برباد کرنا جرم ہے۔ امت کے سرمائے میں امت کے دشمنوں کو ترجیح دینا جرم ہے۔ کسی بے گناہ کو نظر بند کرنا جرم ہے۔ کسی انسان کو کسی بھی عوامی مسئلے میں اظہار رائے سے روکنا جرم ہے۔ اقتدار کے کسی بھی ادارے کا کسی شہری کی آزادی یا عزت پر حملہ کرنا جرم ہے۔

سوچیئے اگر امت میں ایسے لوگ ہوتے جو لوگوں کے ان گناہوں اور جرائم کی درجہ بندی کرتے جو حاکم اور محکوم کی حیثیت سے ایک دوسرے کے خلاف سرزد ہوتے ہیں۔ چنانچہ

امت کو بتاتے کہ ان میں گناہ کبیرہ کون ہیں اور گناہ صغیرہ کون ہیں۔مثال کے طور پر کہا جاتا: حاکم کا استبداد گناہ کبیرہ ہے۔امت کے ساتھ اس کا مشاورت نہ کرنا گناہ کبیرہ ہے۔جو ایسی حالت کو درست قرار دیتا ہو اس کا عمل بھی گناہ کبیرہ ہے۔اس پر خاموشی بھی گناہ کبیرہ ہے۔انسان کو اس کی رائے کے اظہار سے محروم کر دینا گناہ کبیرہ ہے۔لوگوں کی نگرانی ان کی جاسوسی اور ان کی غلطیوں کا ریکارڈ بنانا یہ سب کبائر ہیں اللہ ان پر محاسبہ کرے گا۔ان کبیرہ گناہوں میں شرکت ،ان کی حوصلہ افزائی یا ان پر خاموشی بھی کبائر ہیں۔امت کی دولت کو تنخواہ اور انعام کے طور پر امت کی جاسوسی کرنے والوں میں بانٹنا مال کا ضیاع ،فضول خرچی اور اسراف ہے۔ظالموں کے معاونین ظلم پر مدد کرنے کے صلے میں جو رقمیں پاتے ہیں وہ نجس ہیں ،حرام ہیں ،چوری ،بغاوت ،سود اور زنا کی اجرت سے ان کی حیثیت مختلف نہیں ہے اگر یہ ہو جاتا تو سب ظالموں یا کم از کم کچھ ظالموں یا ان کے معاونوں کو ظلم کی چکی چلانے میں تردد ضرور ہوتا۔اور بہت سارے لوگوں کو ظالموں کا آلہ کار اور مددگار بننے میں تأمل یقیناً ہوتا۔

عالم اسلامی کی موجودہ صورتحال کو دیکھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ آزادی رائے کا فقدان اس امت کے بیشتر ملکوں کی پسماندگی کے بہت سارے اسباب کے پیچھے کارفرما ہے۔ عبدالرحمان کواکبی نے ۱۹۰۱ء میں اپنی کتاب ''**طبائع الاستبداد و مصارع الاستعباد**''میں جو لکھا ہے وہ بہت حد تک کافی ہے یہ سمجھنے کے لئے کہ استبداد سماجی زندگی کے تمام پہلوؤں کو کس طرح متاثر کرتا ہے اور کس طرح وہ فعالیت کو ضعف اور طاقت کو بے بسی میں بدل ڈالتا ہے۔ استبداد تہذیب ساز انسان نہیں بناتا ہے وہ تو بس پرزے ڈھالتا ہے جو سیاسی نظام کے دائرے میں گھومے اور انسان کے جسمانی (بایولوجیکل) تحفظ کے لئے سب کچھ کرے۔یہیں سے تہذیب کی از سر نو تعمیر کی جدوجہد کے لئے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ آغاز میں ہی تہذیبی عمل کے لئے سب سے خطرناک علت یا مہلک تر عامل کو تلاش کر کے درست کیا جائے۔شاید آزادی

رائے دوسرے تمام مسائل کے حل کیلئے بھی ایک معروضی اور لازمی شرط قرار پائے۔ کیونکہ کسی چیز کے اندر زندگی اور فعالیت رہ نہیں سکتی ہے اگر ہر بڑے چھوٹے مسئلے پر غور وفکر اظہار رائے اور تبادلہ خیال کی آزادی نہیں ہو۔ اور یہ جب ہوگا جب مرد مسلم کی عقل سے ساری حجابات دور کردئے جائیں۔ اس کی عقل کو سیاسی نظام جماعت پارٹی لیڈر مفتی اور فکری رہنما وغیرہ کی ساری بیڑیوں سے آزاد کردیا جائے۔ اس کے سامنے فکر کے وسیع وعریض بے قید آفاق کھول دئے جائیں۔ عزت وکرامت آزادی شورائیت اور عدل کے تصورات اس کے دل میں پختہ کردئے جائیں تاکہ اس کے دل ودماغ میں وہی داخل ہو جس کے لئے واقعی دلیل موجود ہو اور وہ اس پر مطمئن ہو۔ ایسی صورت میں فرد کسی نظام یا پارٹی یا جماعت یا مسلک کا پرزہ نہیں بنے گا بلکہ وہ صرف حق کا تابع ہوگا اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا مقصد تخلیق بھی یہی ہے۔

یہ مقالہ جسے آج ہم پیش کررہے ہیں امت کے محققین علماء اور مفکرین کی جانب سے آزادی رائے کے موضوع پر بحث اور گفتگو کا دروازہ کھولنے کیلئے لازمی تمہید ہے۔ اس کے مصنف ڈاکٹر عبدالمجید نجار نے اس سے پہلے اس موضوع پر اپنی کتاب ''**العقل والسلوک**'' میں روشنی ڈالی تھی۔ اسی طرح ڈاکٹر عمادالدین خلیل نے قریبی مگر مختلف نقطہ نظر اپنی کتاب ''**حول اعادة تشكيل العقل المسلم**'' میں پیش کیا جسے مصنف کی نظر ثانی اور جدید اضافوں کے بعد ادارے نے دوبارہ شائع کیا۔ مسلمانوں کے درمیان فکری وحدت میں آزادی رائے کے کردار کو بتانے کے لئے یہ مختصر اور بھرپور مقالہ اس موضوع پر متعدد فکری کاموں کے لئے کلید ہوگا۔ یہاں تک کہ یہ موضوع ہر مسلمان کا خواب اور آرزو بن جائے۔ وہ اسی کے ساتھ جئے اور اسی کی تکمیل کے لئے کوشش کرے۔ اس دنیا کی زندگی میں ایک مسلمان کا منتہائے مقصود یہی ہے۔ ہمارا کردار انسان کو انسان کی حیثیت میں آزادی دلانا ہے۔ بندوں کو بندوں کی غلامی سے نکال کر صرف ایک اللہ کی بندگی میں لانا ہے۔ ہر طرح کے مذہب اور نظام کے ظلم سے نکال کر اسلام کے

عدل میں لانا ہے جس کا مطلب ہوتا ہے انسانی تنظیمی اور سیاسی بیڑیوں سے نکل کر آزادی کی بلند تر چوٹی پر پہونچنا، جہاں سارے انسان مقام ومرتبہ، رائے اور کردار میں برابر ہو جائیں۔ سب اللہ واحد کے بندے ہیں اللہ نے جو کچھ پیدا کیا ہے اس میں یکساں ہیں۔ سب اللہ کے خلیفہ ہیں اور اس کی شریعت کے مخاطب ہیں۔ ہر ایک کے لئے آسان کر دیا گیا وہ کام جس کے لئے وہ پیدا کیا گیا ہے۔ تقوی اور کار تمدن کی ادائیگی اور تہذیبی سفر کی تکمیل میں انسانی حصہ داری کے سوا کسی کو کسی پر برتری اور رفعت حاصل نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمارے بھائی ڈاکٹر عبد المجید نجار کو ان کی اس کاوش کا بہترین صلہ دے۔ اس امید کے ساتھ کہ ہمارے اہل فکر وقلم اس موضوع کے مختلف پہلوؤں پر اپنی قلمی کاوشیں جاری رکھیں یہاں تک کہ یہ تصورات امت میں ذہن نشین ہو کر اس کے کردار کا حصہ بن جائیں۔ اس دن مومنوں کو اللہ کی نصرت سے خوشی حاصل ہوگی۔

ڈاکٹر طٰہٰ جابر علوانی

صدر عالمی معہد برائے اسلامی فکر

تمہید

رسول ﷺ نے سارے مسلمانوں کو خطاب کر کے کہا تھا: ''تم سب نگہبان ہو اور تم سب اپنی رعایا کے سلسلے میں جوابدہ ہو، حاکم نگہبان ہے وہ اپنی رعایا کے بارے میں جواب دہ ہے، مرد نگہبان ہے اور وہ اپنی رعایا کے بارے میں جواب دہ ہے، عورت شوہر کے گھر کی نگہبان ہے اور وہ اس کے لئے جواب دہ ہے، غلام آقا کے مال کا نگہبان ہے اور وہ اس کے لئے جواب دہ ہے۔ سنو تم سب نگہبان ہو اور تم سب اپنی رعایا کے بارے میں جواب دہ ہو'' (صحیح مسلم)۔ اس حدیث پاک سے سمجھ میں آتا ہے کہ ہر مسلمان فرداً فرداً مسلمانوں کے مفاد کا ذمہ دار ہے۔ ذمہ داری کے دائرے اس کی پوزیشن کے لحاظ سے وسیع اور مختصر ہو سکتے ہیں۔

نگہبانی کی یہ ذمہ داری تقاضا کرتی ہے کہ ایک مسلمان ایسی اقدامی سوچ اور رائے کا خالق ہو کہ اس کی نگہبانی کا انداز زمان و مکان کی تبدیلیوں کے تقاضوں کے مطابق نگہبانی کے مقاصد کو حقیقت میں شرمندہ تعبیر کرے۔ اس طرح مسلمان کا اپنی رائے ظاہر کرنا بھی ایک لازمی ذمہ داری ہو جاتی ہے کیونکہ وہ نگہبانی کے فرض کو ادا کرنے کے لئے ناگزیر ہے۔ ساتھ ہی ان اسباب پر قدرت رکھنا بھی جو صحیح رائے کے اظہار کو ممکن بنائیں امر واجب ہو جاتا ہے اس اصول کے تحت کہ واجب کی تکمیل جس چیز کے بغیر نہیں ہو وہ چیز بھی واجب ہے۔

اور جب اظہار رائے اس عمومی انداز سے مسلمانوں پر واجب ہے تو فطری بات ہے کہ اس کے نتیجہ میں رایوں میں اختلاف کا امکان بھی اس وقت بڑھ جائے گا جب مشترک دائرے میں نگہبانی کی ذمہ داریوں میں ٹکراؤ ہو، کیونکہ مسلمانوں کے درمیان شرعی نقطہ آغاز ایک کیوں نہ ہو مگر رائے کی بنا جن معلومات پر رکھی جاتی ہے ان میں اختلاف بہت سارے مواقع پر

رائے بنانے میں اختلاف کا سبب بنے گا۔

چونکہ امت کی وحدت کی حفاظت بھی ایک دینی فریضہ ہے اور نگہبانی کی اسلامی ذمہ داری کے ضمن میں یہ ذمہ داری بھی شامل ہے۔ دو پہلوؤں کے درمیان ایک مشکل موازنے کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ اظہار رائے کی ذمہ داری جو اختلاف کا سبب بن سکتی ہے اور امت کی وحدت کی حفاظت۔ اس موازنے کو مزید دشوار بنانے والی چیز یہ ہے کہ مسلمان جس رائے کا اظہار کرتا ہے وہ دینی رائے شمار ہوتی ہے کیونکہ دین اسلامی زندگی کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہے۔ گویا ایک عام ذمہ داری کی حیثیت سے اظہار رائے جس اختلاف کا سبب بنے گا وہ دینی رنگ کا حامل اختلاف ہوگا ساتھ ہی وہ امت میں تفرقہ کا ایک محرک بھی بنے گا۔

امت مسلمہ کی تاریخ میں ایک رجحان پروان چڑھا جو پہلے فرض کو قربان کر کے اس مسئلے کو حل کرنے کا قائل تھا۔ اس نے اظہار رائے کی آزادی کو ختم کر دینے کی حد تک تنگ کر دیا تاکہ امت کی وحدت اور دین کی وحدت محفوظ رہے۔ تضییق کے اس عمل سے دونوں دوچار ہوئے، رائے کا اظہار کرنے والے مسلمان اور وہ مسائل جن میں رائے کا اظہار ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ دونوں کے سلسلے میں بندشیں وجود میں آگئیں جو حالات کے لحاظ سے سخت اور ڈھیلی ہوتی رہیں۔ کبھی لگتا کہ آزادی رائے پر پابندی سی لگ گئی ہے اور کبھی اسے مخصوص افراد اور مخصوص مسائل کے تنگ کردہ دائرے میں محصور کر دیا جاتا۔ آزادی رائے کو کچلنے والا یہ رجحان امت اسلامیہ کے مختلف ادوار میں سنہرے اولین دور کے بعد سے اب تک ہمیشہ موجود رہا۔ تاہم اس کی حکمرانی کا سب سے زیادہ جلوہ تصوف کے پھیلاؤ میں نظر آتا ہے جو مریدوں کی فکری سرکوبی پر قائم ہو ہے یا پھر سیاسی استبداد کے پھیلاؤ میں دکھائی دیتا ہے جس کی فطرت میں مخالف آواز کو کچلنا موجود ہے۔

قرآن کریم میں آزادی رائے کو جس طرح دین کا اصول قرار دیا گیا ہے اسے دیکھتے

ہوئے ایسا لگتا ہے کہ آزادی رائے میں افراط کی وجہ سے امت کی وحدت پر پڑنے والے منفی اثرات کا اندیشہ وہ اندیشہ تھا جس میں شدت آتی گئی۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ صرف شرعی احتیاط کا دامن تھاما جاتا اور ایسی شرطوں کو اختیار کیا جاتا جو یہ ضمانت لیتیں کہ آزادی رائے کو شریعت میں جگہ دینے سے جو ثمرات مقصود ہیں وہ حاصل ہوں گے، مگر اس کے بجائے ہوا یہ کہ صحیح نگہبانی کے ایک اہم ذریعہ کو معطل کر دیا گیا۔ جبکہ اظہار رائے تو اس کے لوازم میں شامل ہے جیسا کہ ہم نے پیچھے ذکر کیا۔

آگے ہم یہ ثابت کرنے کی کوشش کریں گے کہ آزادی رائے جو ایک قرآنی اصول ہے مسلمانوں کے درمیان افتراق کا سبب نہیں تھا جیسا کہ لوگوں کو ڈر ہوا اور انہوں نے اسے معطل یا نیم معطل کر دیا۔ اور پھر فکر و سیاست میں اہل استبداد نے اس پابندی کے پھل سمیٹے۔ بلکہ اس کے برعکس یہ اتحاد کے طاقتور ترین عوامل میں سے ایک ہے۔ اس حقیقت کو ہم اسلامی وحدت کے ایک مظہر یعنی فکری وحدت کے سلسلے میں وضاحت سے پیش کریں گے۔ اس وجہ سے کہ فکری وحدت عموماً ساری اقوام اور خاص طور سے امت اسلامیہ کی وحدت کے اہم ترین ارکان میں شمار ہوتی ہے۔

آیئے دیکھیں آزادی رائے کا مسلمانوں کی فکری وحدت میں اہم رول کیسے ہے؟؟

فصل اول:

مسلمانوں کی فکری وحدت

۱۔فکر

اس گفتگو کے آغاز میں بہتر ہے کہ ہم فکر کا مفہوم متعین کر دیں کیونکہ اسی پر فکری وحدت کے مفہوم کی بنا قائم ہوتی ہے۔اس تعیین کے لئے ہم یوں بھی مجبور ہیں کہ آج یہ لفظ مختلف معنوں میں استعمال ہونے لگا ہے جو زمانے کی گردش کے ساتھ ساتھ بہت زیادہ ہو گئے اور بغیر پیشگی تعیین کے اس لفظ کا استعمال بہت دفعہ اشتباہ کا سبب بن جائے گا۔

ہوسکتا ہے کہ فکر کا جو مفہوم ہم متعین کریں گے اور جو پوری بحث میں ہمارے پیش نظر رہے گا وہ اس لفظ کے مروجہ استعمال سے کچھ اجنبی سا ہو۔مگر ہم اس کی تعیین میں قرآن کریم کے استعمالات اور لغت کی کتابوں پر اعتماد کریں گے نیز اسلامی تہذیب کے آغاز میں اہل اسلام کی اصطلاح سے لیکر ابن خلدون کے عہد تک اس کے مقدمہ میں اس لفظ کا استعمال ہمارے پیش نظر رہے گا۔

کتب لغت میں یوں کہا گیا ہے: الفکر، کسی چیز میں نظر یا خیال کو عمل میں لانا۔(لسان العرب، القاموس۔ مادۃ فکر) اس کا مطلب ہوا کہ فکر کسی موضوع میں ذہن کی حرکت ہے (جسے عمل میں لانے سے تعبیر کیا گیا) تا کہ اس کے سلسلے میں معرفت حاصل کی جائے، گویا وہ کیفیت کے باب سے ہے نا کہ ان صورتوں اور معلومات کے باب سے جو ذہن میں رہتی ہیں۔کیونکہ ذہن کی حرکت ایک کیفیت ہے۔قرآن کریم میں تفکر کا مادّہ زیادہ تر اللہ تعالیٰ کی آیات اور اس کی

کائنات میں اس کی تخلیق کے ساتھ وارد ہوا ہے۔ارشاد باری ہے:{كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰه لَكُم الآياتِ لعلَّكُم تَتَفَكَّرُون﴾(سورة البقرة : ۲۱۹) مزید{وَيَتَفَكَّرُوْن فی خَلْقِ السَّماواتِ والأرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَابَاطِلاً﴾(سورة آل عمران :۱۹۱)۔

غرض تفکر ذہن کو اللہ کی آیات کے سلسلے میں عمل میں لانا ہے تا کہ اس کے وجود اور صفات کی حقیقت تک رسائی ہو۔فکر اور تفکر ہم معنی ہیں کیونکہ فَکَرَاور تَفَکَّرَیعنی دونوں کے افعال بھی ہم معنی ہیں۔اہل اسلام نے فکر کو اس کیفی مفہوم میں استعمال کیا ہے جو ذہن کی معلوم سے مجہول کی طرف حرکت کو بتاتا ہے ۔اسی کو تعبیروں کے اختلاف مگر مفہوم میں یکسانیت کے ساتھ ابن سینا (ت۴۲۸ھ)فخر الدین رازی(ت۶۰۶ھ)اور ابن خلدون(ت۸۰۸ھ)نے بیان کیا۔

سید شریف جرجانی(ت۸۱۶ھ)نے تعریفات میں اسے اختصار کے ساتھ یوں بیان کیا:فکر معلوم امور کو اس طرح ترتیب دینا ہے کہ مجہول تک پہونچیں''(التعریفات ص۱۷۶)ہم اس بحث میں لفظ فکر کو اسی معنی کیفی میں استعمال کریں گے ہماری مراد ہوگی وہ منہج اور طریقہ جسے عقل معرفت تک پہونچنے کے لئے اختیار کرتی ہے۔اس طرح فکر اسلامی کا مطلب ہوگا وہ منہج جس کے مطابق مسلمان سوچتے ہیں یا جس کے مطابق انھیں سوچنا چاہئے۔فکر کا وہ مفہوم جو آج رائج ہے یعنی وہ اصول اور تعلیمات جنھیں اسلام نے پیش کیا یا وہ افکار ونظریات جو مسلمانوں کے ذریعہ وجود میں آئے یا ایسی وہ ساری چیزیں جو علوم ومعارف کی شکل میں موجود کا حکم رکھتی ہیں، ہماری مراد نہیں رہے گا۔

۲-فکری وحدت

فکر جیسا کہ ہم نے طے کیا معرفت تک پہونچنے کے لئے عقل کے استعمال کا طریقہ ہے تو لوگوں کے مجموعہ کے درمیان فکری وحدت سے مراد عقل کے استعمال کے طریقہ میں اس طرح کا اشتراک ہے کہ وہ اس سلسلے کی یکساں صفات وخصوصیات میں ہم آہنگ ہوں۔کسی مجموعہ

کے افراد میں طریقہ فکر کے اوصاف میں جتنا اشتراک پایا جائے گا اسی قدر فکری وحدت سے وہ باہم مربوط ہوں گے۔ اگر ان میں سے ہر کسی نے فکر کا الگ طریقہ الگ مخصوص اوصاف کے ساتھ اختیار کیا تو فکری وحدت کا شیرازہ بکھر جائے گا اور وہ فکری انتشار کا شکار ہو جائیں گے۔

یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اس مفہوم میں کسی بھی قوم کے لئے فکری وحدت اس کی ہمہ گیر وحدت کے لئے اساسی رکن ہے۔ ایسا اس لئے کہ وہ نظری اور عملی رائیں جو زندگی کی تنظیم کرتی ہیں وہ اسی منہج کا ثمرہ ہوتی ہیں جسے عقل ان تک رسائی کے لئے اختیار کرتی ہے۔ منہج جس طرح کا ہوگا گمراہی یا ہدایت پر مشتمل اسی طرح کی راہیں سامنے آئیں گی۔ اسی سے وضاحت ہوتی ہے کہ قرآن کریم نے کیوں اس قدر شدید اصرار کے ساتھ عقل کو کائنات کی محسوس نشانیوں میں غور کرنے کے لئے متوجہ کیا۔ گویا ایک فکری منہج دیا جو اللہ اور اس کی صفات کی معرفت میں قطعی طریقے سے حق تک پہونچائے۔ اسی پر عقیدہ کے علماء نے یہ اصول مرتب کیا کہ فکر میں صحیح منہاج حتمی طور سے حق کی معرفت تک پہونچائے گا۔ اس کو امام الحرمین ابو المعالی الجوینی (ت ۴۷۸ھ) نے یہ کہہ کر ثابت کیا کہ صحیح غور وفکر اگر صحیح رخ پر ہو اور اس کے اوپر علم کے منافی کوئی آفت نہ آپڑے تو زیر غور معاملے میں براہ راست علم یقینی حاصل ہوتا ہے'' (الارشاد ص ۲۷) اسی بنیاد پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ امت کے افراد کے درمیان فکری وحدت زندگی کی ہمہ گیر تنظیم کرتے ہوئے تصور اور حل دونوں میں وحدت کا سبب بنے گی۔ اور اگر غور وفکر کے راستے جدا جدا ہو گئے اور اس کے منہج میں فرق آ گیا تو ہر کوئی رائے اور عمل دونوں میں ایک دوسرے کے مخالف نقطہ نظر تک پہونچے گا اور یہی افتراق وانتشار ہے۔

گویا مسلمانوں کی فکری وحدت مسلمانوں کا اس ذہنی عمل کی بڑی منہجی بنیادوں میں وہ اتفاق ہے جو زندگی اور کائنات کے امور میں غور وفکر کرتے ہوئے عمل میں آتا ہے۔ تاکہ اس حقیقت تک رسائی ہو جس پر وہ کائنات سے اپنے تعلق کی بنا استوار کریں اور جس کے ذریعہ

زندگی کے مسائل کی تنظیم کریں۔ اور یہ سب اس دین کی تعلیمات کے دائرے میں ہو جس نے انہیں ایک امت میں جمع کیا ہے۔

ہم نے بڑی منہجی بنیادوں کی قید اس لئے رکھی ہے کہ فکر کی ثانوی فروعات میں منہجی طریقوں کی بہت زیادہ اہمیت فکری وحدت کی تشکیل میں نہیں ہوتی ہے اسی لئے آئندہ ہم انہیں منہجی بنیادوں پر اکتفا کریں گے جنہیں ہم فکری وحدت کے ارکان تصور کرتے ہیں۔

یہ منہجی ارکان جس قدر مسلمانوں میں عقلی غور وفکر کے طریقوں کے طور پر عام ہوں گے اسی قدر ان کے درمیان فکری وحدت حاصل ہوگی جو ان کو ہمہ گیر وحدت تک لے جائے گی۔ اور جس قدر مسلمانوں کا ان میں اختلاف ہوگا اور ہر گروہ کا الگ غور وفکر کا منہج ہوگا جس کے اوصاف دوسروں کے منہج کے مخالف ہوں اسی قدر ان کے درمیان افتراق ہوگا کیونکہ یہ اختلاف زندگی کی تنظیم کے لئے پیش کردہ نظریات وتجاویز میں اختلاف کا سبب بنتا ہے۔ ہمارے سامنے مسلمانوں کی تاریخ میں اس کا واضح مصداق موجود ہے۔ امت اسلامیہ جب اپنے فکری منہاج میں ان خصوصیات سے آراستہ تھی جن سے قرآن کریم نے خاص طور سے اس کی زندگی کے اولین مرحلے میں ان کو نوازا تھا اور مسلمانوں کے درمیان یہ خصوصیات مشترک تھیں۔ اس وقت امت اسلامیہ کے وحدت کے مظاہر اس حقیقت کا مصداق تھے۔ اور اسی طرح باہر سے درآمد فکری مناہج نے افتراق کے جو مظاہر پیدا کئے جیسے یونان کے صوری منہج اور تصوف کے اشراقی منہج نے قدیم میں جو کچھ کیا اور مغرب کے مادی رجحان سے مغلوب منہج آج جو کر رہا ہے وہ بھی اس کا مصداق ہے۔

۳۔فکری وحدت کا محرک

اگر یہ درست ہے کہ لوگوں کی فکری وحدت کا مطلب ان اساسی اوصاف میں ان کا اشتراک ہے جن کے ہمراہ ان کے غور وفکر کا عمل ہوتا ہے۔ تو پھر وہ بنیادی محرک کیا ہے جو اس وحدت کا سبب بنتا ہے اور جس کے باعث لوگ فکر کے منہج میں یا کم از کم اس کی بنیادی خصوصیات

میں مشترک ہو جاتے ہیں۔

نظری اور عملی معرفت کیلئے عقل انسانی کی کوشش کے منہج کی تشکیل بنیادی طور سے اس اعتقادی (آئیڈیالوجیکل) سرمایے کے تابع ہوتی ہے جو انسان کے پاس وافر شکل میں ہوتا ہے۔ وجود کائنات اور انسان کے انجام سے متعلق عقائد ہی طرز نظر یعنی فکر کی تشکیل کرتے ہیں۔ اس لئے بیشتر صورتوں میں کسی نظریے پر اطمینان کے لحاظ سے قوموں کا فکر کے منہج میں اختلاف ہوتا ہے۔ بطور مثال یونانیوں کا فلسفہ دیوتاؤں کے ایسے تصور پر قائم تھا جو محسوسات کی دنیا سے بلند ہوتے تھے۔ وہ اس دنیا کے کاروبار سے لاتعلق تھے۔ اسی طرح عقلی اور روحانی مجردات کی برتری اور محسوس مادے کی تحقیر پر ان کے فلسفہ کی عمارت تھی۔ اس کے نتیجہ میں معرفت کا وہ منہج انہیں ملا جو تجرید وتصور پر مبنی تھا۔ مگر جب اسلام ایسے عقیدے کے ساتھ آیا جس کی بنیاد یہ تھی کہ اللہ محسوس مادی دنیا کا براہ راست مدبر و منتظم ہے۔ اور محسوس مادہ حقیر نہیں ہے بلکہ اس لحاظ سے اسے عظمت حاصل ہے کہ وہ اللہ کی نشانیوں کی جلوہ گاہ ہے۔ اس سے انہیں معرفت کا وہ منہج حاصل ہوا جس میں عقل محسوس حقائق کو حقیقت کی دریافت اور امور زندگی کے انتظام کا نقطہ آغاز بتاتی ہے۔ فکر میں یہ اختلاف نظریاتی اطمینان میں اختلاف کا نتیجہ ہے۔ اس طرح یہی اس کی تشکیل کا سب سے بڑا محرک ہے بطور خاص جبکہ وہ یقین دینی و مذہبی ہو۔

تو جب امر واقعہ یہی ہے تو کسی قوم کی یا کسی افراد کے مجموعے کی فکری وحدت ان کی اعتقادی وحدت سے نشو ونما پاتی ہے۔ اگر وہ وجود، کائنات اور انسان کے انجام کے تصور میں ہم خیال ہیں یا کم از کم قریب الخیال ہیں۔ تو ان کے یہاں فکر کا منہج بھی ایک یا باہم قریب ہوگا۔ اسی لئے کسی قوم پر معرفت کا کوئی بھی منہج حکمراں ہو وہ اعتقادی ہم آہنگی کے سبب ہی ہوتا ہے۔ اگر وہ قوم اپنی آئیڈیالوجی کو بدلنے پر متحد ہو جائے تو نئے فکری منہج میں بھی متحد ہو جائے گی۔ اسی طرح اگر وہ اپنے فلسفیانہ یا مذہبی اعتقاد میں اختلاف سے دوچار ہوئی تو معرفت کے منہج میں بھی

اختلاف سے دوچار ہو جائے گی۔ آج امت اسلامیہ کی صورتحال کچھ ایسی ہی ہے کہ جب مغرب کی تہذیبی یلغار نے اس پر حملہ آور ہو کر اس کے اعتقادی تصور کے بعض گوشوں میں شگاف ڈالے تو اس سے اس کے معرفت کے منہج میں وہ بے سمتی پیدا ہوئی جو ہم دیکھ رہے ہیں۔ ہماری بات پر یہ اعتراض وارد نہیں ہوتا ہے کہ ایک قوم کے بیچ کچھ لوگ اس کے عقیدہ کے نہیں ماننے والے بھی ہوتے ہیں مگر وہ فکری وحدت یا فکری وحدت نما کیفیت میں شامل رہتے ہیں۔ کیونکہ یہ گہری تہذیبی شیرازہ بندی کے نتیجہ میں ہوتا ہے اور ہم نے جو بات کہی ہے وہ عمومی صورت کی ہے۔

ہم نے جو بات کہی ہے مسلمانوں کی فکری وحدت اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ بلکہ وہ اس ضابطے کی سب سے سچی مثال ہو سکتی ہے۔ یہاں وحدت کا محرک اسلامی عقیدہ ہے جس نے مسلمانوں کو وجود، کائنات اور انجام کے ایک تصور پر جمع کیا۔ یہ ایک خاص تصور ہے کیونکہ وہ توحید مطلق پر قائم ہے، مسلمانوں کا یہ عقیدہ جو انہیں نظریاتی طور پر ہم مشرب بناتا ہے اسی نے غور وفکر کی یکساں منہجی خصوصیات پر ان کی عقلوں کی تشکیل کر کے انہیں ایک نقطہ پر جمع کیا۔ اسی سے وہ ایک طریقہ پر سوچنے لگے اور زندگی کے انتظام میں ملتے جلتے خیالات اور حل کی تجاویز تک پہونچنے لگے۔ اس عقیدہ کو اپنانے کے لئے بہت ساری قومیں لپک کر آئیں۔ یہ نو وارد اقوام اپنے مختلف دینی اور فلسفیانہ عقائد اور تہذیبوں سے نکل کر آئی تھیں مگر اس نئے عقیدہ نے ان کے اندر فکر کے منہج میں انقلاب پیدا کر دیا جس سے وہ فکر کی ایک وحدت میں شامل ہو گئے انہوں نے جو کچھ کتابوں فنون اور تمدن کی صورت میں تخلیق کیا وہ سب اس پر گواہ ہے۔ اس میں سب برابر تھے خواہ کوئی جاہلیت سے نکل کر آیا ہو یا بت پرستی سے، مسیحیت سے یا مجوسیت سے۔ یہ اسلامی عقیدہ ہی وہ محرک تھا جس نے فکر اسلامی کو ایسے منہجی اوصاف پر متحد کر دیا جو مسلمانوں کے درمیان فکری وحدت کے ارکان کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ اوصاف ان کے درمیان جس قدر مشترک ہوں گے اسی قدر فکری وحدت وجود پذیر ہوگی اور جس قدر ان میں ضعف آئے گا وحدت بھی کمزور ہوگی۔

۴-مسلمانوں کی فکری وحدت کے ارکان

قرآن کریم اور حدیث پاک میں اسلامی عقیدہ جس طرح پیش کیا گیا ہے وہ اپنے ماننے والوں میں منہجی انداز کے کچھ فکری اوصاف کا مجموعہ پیدا کرتا ہے۔ یہ اوصاف مجموعی طور سے فکری وحدت کے ایسے مظہر کی تشکیل کرتے ہیں جس کے اثرات واضح طور سے ان نظریاتی اور عملی تجاویز کی یکسانیت میں نظر آتے ہیں جو مسلمان اپنی زندگی کے مختلف پہلوؤں میں اختیار کرتے ہیں۔ اسلامی عقیدے کا وحدت ساز مزاج تو یہی ہے کہ اس عقیدے کے ماننے والوں میں یہ سب اوصاف جنہیں ہم آگے بیان کریں گے یکجا ہو جائیں۔ مگر ضروری نہیں کہ عملا مسلمان ہمیشہ ان کو یکجا کئے ہوئے ہوں۔ بلکہ ان کی تاریخ میں ان کی یکجائی کے ادوار کا بھی مشاہدہ کیا گیا ہے اور اسی طرح اس سلسلے میں انتشار اور بدنظمی کے ادوار بھی دیکھے گئے ہیں۔ کوئی شک نہیں ہے کہ اسلامی عقیدے سے گہری وابستگی فکری یکجائی کو عملی شکل دینے کا سب سے بڑا محرک ہے مگر دوسرے اہم محرکات بھی ہیں جن کا اس میں بڑا کردار ہے۔ جیسے آزادی رائے کا محرک جس کی وضاحت آگے آئے گی۔

عقیدہ فکری وحدت کے جن اہم ارکان کو استوار کرتا ہے وہ حسب ذیل ہیں:

[الف] نظر کی ہمہ گیریت

اس سے مراد ہے مسائل کی دریافت میں عقل کی ہمہ گیر پیش قدمی جو ان کے تمام پہلوؤں کو سامنے رکھے اور ان سے متعلق تمام معلومات کو سمیٹ لے تاکہ ان کے سلسلے میں حق تک پہونچنے کی ضمانت ملے۔ کسی موضوع بحث میں غور وفکر کرتے وقت معلومات کو جمع کرنا اور ہر اس چیز کو سمیٹنا جس کا اس سے کچھ بھی تعلق ہو حقیقت کی دریافت کے راستوں کو روشن کرتا ہے۔ وہ

جزوی نگاہ جو بعض معلومات اور پہلوؤں تک محدود رہتی ہے وہ زیادہ تر کوتاہ رائے تک پہونچاتی ہے اور پوری حقیقت سے پردہ نہیں اٹھاتی ہے۔

اسلامی عقیدہ میں عقل کی اس ہمہ گیر منہج پر تربیت کا سامان ہے۔ اسلامی تعلیمات ہمہ گیریت کے ساتھ یہ بیان کرتی ہیں کہ وجود کی حقیقت میں کیا ہے؟ اور انسان کی زندگی میں کیا ہونا چاہئے؟ ۔ قرآن کریم ذہن کو متوجہ کرتا ہے کہ وہ کائنات پر اس کی تخلیق اس کے نظام اس کی حرکت اور اس کی ترکیب پر ایک ہمہ گیر نظر ڈالے، تاکہ وہ اس کے قوانین دریافت کر سکے اور یہ جان سکے کہ وہ اپنے ماوراء حقائق پر کیسے دلالت کرتے ہیں۔ اسی طرح وہ قوموں کی تاریخ پر بھی ہمہ گیر نگاہ ڈالنے پر متوجہ کرتا ہے۔

عقیدہ کی اس ہمہ گیریت سے اور قرآن کریم کی ہمہ گیر نظر پر ترغیب سے عملا اسلامی عقلیت میں نگاہ کی ہمہ گیریت کی صفت وجود میں آئی اور فکر اسلامی کی ایک خصوصیت بن گئی جسے ہم نمایاں طور سے مسلمانوں کے علمی ترکے کی تمام فروعات میں دیکھ سکتے ہیں۔ بطور مثال آپ دیکھئے، مفسرین اور حدیث کے شارحین کو کہ کیسے وہ مراد خداوندی کی حقیقت تک پہنچنے کے لئے لغت، بلاغت، تاریخ جو اسباب نزول کی صورت میں ہے، ریاضیاتی علوم کی نمائندہ حکمت اور کائناتی سائنس کے نتائج کو جمع کرتے ہیں پھر ان ساری چیزوں کو انوکھی ہمہ گیریت کے ساتھ حقیقت تک رسائی کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ جیسا کہ ہم تفسیر رازی میں دیکھتے ہیں جس میں اس زمانے کے تمام علوم کو قرآنی حقیقتوں کی دریافت کے لئے استعمال کیا گیا۔ ہمہ گیریت کی اس خاصیت کی بہترین توصیف طاش کبری زادہ نے اپنی انسائیکلوپیڈیا کے آغاز میں اسلامی علوم کو شمار کرتے ہوئے کی۔ جب انہوں نے بتایا کہ مسلمانوں نے حقیقت کی تلاش اس کے وجود کی چار سطحوں پر جا کر کی۔ حقیقت میں عینی وجود، ذہن میں صوری وجود، عبارت میں لفظی وجود اور کتابت میں خطی وجود۔ پھر انہوں نے اسی کو علوم شماری کے لئے اساس بنایا۔ (مفتاح السعادۃ ج ا ص ۱۷)۔

یہ واضح ہے کہ نگاہ میں ہمہ گیریت کی صفت اہل نظر میں وحدت پیدا کرنے والی صفت ہے اسلئے کہ وہ بڑی حد تک ضمانت لیتی ہے کہ جس علمی حقیقت تک رسائی مطلوب ہے یا زندگی کے سفر میں جن نئی مشکلات کا حل زیر بحث ہے اس میں نقطہ ہائے نظر یکساں ہوں گے۔ اور اس طرح تعمیری تحریک کے ضمن میں ہونے والی ساری کوششیں ایک شیرازہ میں مربوط ہو جائیں گی ۔ جب کہ جزوی منہج میں جس میں بہت سارے امور کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے اندازے کی غلطی کا امکان زیادہ ہوتا ہے اور وہ غلطی افتراق کا سبب بنتی ہے۔ شاید علی بن أبی طالبؓ سے پھوٹ کر اور اس کے بعد پے در پے انقلابی کوششوں کے ذریعہ خوارج نے جو افتراق پیدا کیا تھا اس کا یہی سبب تھا کہ انہوں نے قرآن فہمی اور اس کے احکام کی تطبیق میں جزوی منہج کو استعمال کیا تھا اور فہم وتطبیق کے بہت سارے تقاضوں کو نظر انداز کر کے الفاظ کے ظاہر پر اکتفا کیا جس کے نتیجہ میں اپنے مخالف مسلمانوں کی تکفیر تک جا پہونچے اور تکفیر کو خونی جنگوں اور ہلاکت خیز انقلابی کوششوں پر منتج کر ڈالا۔ آج بھی فہم کے جزوی منہج کو استعمال کر کے مسلمانوں کے درمیان انتشار پیدا کرنے والے خوارج نما افراد موجود ہیں۔

[ب] وحدت سازی اور رابطہ بندی

اس سے مقصود یہ ہے کہ حق کی تلاش میں عقل کی توجیہ اس طرح کی جائے کہ وہ حاصل شدہ امور کو ہم آہنگ کرے اور مشابہت اور مماثلت کی بنیاد پر سب کو ایک دوسرے سے جوڑے اور انہیں دلالت کی ایک کسوٹی پر یکجا کر دے، یہی وہ بنیاد بنے جس میں فہم وتعلیل کی ساری کوششوں کی شیرازہ بندی کر دی جائے اور اس کی بنیاد پر نقطہ نظر اور تجاویز کی بنا رکھی جائے۔ یہ خاصیت یقیناً ضامن ہے کہ معرفت کے احکام کی ایک کسوٹی ہوگی اور اس طرح اس کے نتائج متضاد ہونے کے بجائے ہم آہنگ ہوں گے۔ چاہے یہ کائناتی معرفت میں ہو جو تجربے میں اصولوں کی وحدت پر قائم ہو یا شرعی اور انسانی معرفت میں ہو جو مبدأ اور غایت کی وحدت پر قائم

ہو۔

ہاں اگر عقل حاصل شدہ معلومات میں معیار کے دوہرے پن کے ساتھ عمل پیرا ہو اور ان کے درمیان جامع تعلق کو نظر انداز کر دے تو وہ یقیناً ایسے نتائج واحکام تک پہونچے گی جن میں باہم ٹکراؤ ہوگا اور بہت دفعہ حق ان سے دور سے ہوگا۔

نگاہ میں رابطہ بندی اور وحدت سازی کے اسی طرز پر عقل کی تشکیل کا سامان اسلامی عقیدہ میں موجود ہے۔ یہ عقیدہ توحید مطلق پر استوار ہوتا ہے گویا کائنات میں جو کچھ ہے اس کا مبدأ ایک ہے خواہ اس کے انواع بہت ہوں اور باہم مختلف بھی ہوں۔ اسی طرح اس کائنات کا نظام ترکیب وحرکت میں اور ظہور وخفا میں ایک قانون پر چلتا ہے۔ اس کا سفر ایک منزل کی سمت جاری وساری ہے۔

وہ اللہ ہے جو آغاز کرنے والا، انتظام کرنے والا، اور دوبارہ آغاز کرنے والا ہے۔ انسان کی زندگی کی مختلف تبدیلیوں کے باوجود ایک ہی سمت ہے اور وہ اللہ کی عبودیت کے ذریعہ زمین میں خلافت کو یقینی بنانا ہے۔ یہ وحدت ساز معیار جس پر اسلامی عقیدہ قائم ہے وہ بجا طور پر مومن کی عقل کو فہم، تعلیل اور حکم میں رابطہ بندی اور وحدت سازی کا مزاج دیتا ہے۔

منہج کی یہ خاصیت ترقی کے دور میں فکر اسلامی میں نمایاں ہو کر ظاہر ہوئی تھی۔ صاف نظر آتا ہے کہ اسلامی علوم وہ بھی جن کی نئی ایجاد ہوئی تھی اور وہ بھی جو ماخوذ تھے ان کی قالب سازی آغاز میں بھی اور ارتقاء میں بھی قرآن کی اور اس کے توحیدی مشتملات کی خدمت کے لئے ہوئی تھی۔

کوئی بھی شرعی یا انسانی یا کائناتی موضوع بحث ہو عقل انسانی کشاں کشاں ایک ہی غایت تک بڑھتی جاتی تھی اور وہ غایت انسانی زندگی میں توحید کے تقاضوں کی تکمیل تھی۔ طاش کبری زادہ اور ابن خلدون نے اپنی اپنی علوم کی درجہ بندی میں اس سلسلے کی بہت اہم وضاحتوں

کوذکر کیا ہے۔

یہ منہجی خاصیت فکر کی وحدت سازی میں نمایاں اثر کی حامل ہے۔حاصل شدہ امور میں رابطہ بندی پر اعتماد اور تحلیل اور مقصد کی تکوین میں اصول واحد کے طریقہ کا انتخاب متوقع طور سے مشترک یا باہم قریب تر نتائج اور ہم آہنگ فیصلوں اور حل کی تجاویز تک لے جائے گا۔ ایسی صورت میں وہ سب لوگ جو اس منہج کو اختیار کریں گے ٹھیک اسی سمت سے منسلک ہو جائیں گے ۔اور زندگی کی تکمیل میں ایک ہی منزل کی طرف گامزن رہیں گے۔

ترقی کے دور میں اسلام کے تہذیبی عمل میں یہ حقیقت نمایاں ہو کر سامنے آتی ہے۔اس کام میں مسلمانوں کے بیچ ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک اس قدر ہم آہنگی تھی کہ ایک مسلمان علم یا فن یا کاریگری میں اپنی تعمیری زندگی کا آغاز اندلس سے کرتا پھر وہ ماوراء النھر کے علاقے میں چلا جاتا کہ جس کام کا آغاز کیا ہے اسے وہاں جاری رکھے۔اسے کسی پریشانی یا ناکامی کا منھ نہیں دیکھنا پڑتا بلکہ بیشتر حالات میں اسکی تخلیقیت اور شاہکاری میں اضافہ ہی ہوتا۔اس کی مثالیں بے شمار ہیں۔ ہاں اگر تجزیہ کرنے اور غایت طے کرنے کے معیار میں دوہرا پن ہے تو یہیں سے اضطراب اور بے سمتی شروع ہوتی ہے جو افتراق کا باعث بنتی ہے، اس کی واضح ترین مثال آج کے مسلمانوں کی اضطرابی صورتحال ہے۔اس اضطراب کا سبب معیار کا دوہرا پن ہے ایک طرف توحید کی قدریں ہیں تو دوسری طرف مغرب سے درآئی قدریں ہیں ان کی اجتماعی زندگی جن احکام اور قوانین پر چل رہی ہے وہ اس اضطراب کا واضح مصداق ہے۔

[ج] حقیقت پسندی

اس کا مطلب یہ ہے کہ عقل حق کی معرفت کے لئے اپنے سفر کی نقطہ آغاز حقیقت حال کو بنائے۔خواہ وہ حقیقت کائناتی ہو یا نفسیاتی ہو یا تاریخی۔جو ہے اس کی حقیقت تک پہنچنے کیلئے اور جو ہونا چاہئے اس کا اندازہ لگانے کے لئے تحلیل وتجزیہ کا بنیادی اثاثہ یہی حقیقت حال بنے گی

۔ اس کی صورت یا تو یہ ہوگی کہ کائنات کے محسوس مظاہر سے اس کی کلی سنتوں اور قوانین تک تجربے کی راہ سے منتقل ہوا جائے یا مادی نشانیوں اور شواہد سے خلق وانتظام کے بارے میں ان کے غیبی اشاروں تک منتقل ہوا جائے۔ یا انسانی زندگی کی تاریخی اور موجودہ صورتحال سے اس تخمین تک منتقل ہوا جائے کہ بہتری اور ہدایت کی کیا صورتیں ہوسکتی ہیں؟

اس منہجی خاصیت کے منافی تصوراتی خاصیت ہے اور وہ یہ ہے کہ عقل اپنے معرفت کے سفر میں مجرد تصویروں کو نقطہ آغاز بنائے۔ حقیقت حال سے دور رہتے ہوئے انہیں باہم مربوط کرکے ان سے وجود کی تفسیر کرے یا اصلاحی نظریہ بنائے اور انسانوں کی زندگی پر اسے پھینک مارے۔ یہ یونانی فکر کی خاصیت تھی جیسا کہ ہم نے پہلے بھی اشارہ کیا۔

قرآن کریم نے آکر اسلامی فکر کو حقیقت پسندی کا قالب دیا۔ یہ انسانی فکر کی تاریخ میں واقعی ایک منہجی انقلاب شمار کیا جانا چاہئے۔ اس نے عقل کو غیب کے حقائق اور کائنات کے قوانین کا ادراک کرنے کے لئے مادی مظاہر کی طرف اور نفس انسانی کی حقیقت امر کی طرف متوجہ کیا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: {سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الآفَاقِ وَفِي أَنْفُسِهِمْ﴾(سورة فصلت: ۵۳)

(عنقریب ہم ان کو اپنی نشانیاں آفاق میں بھی دکھائیں گے اور ان کے اپنے نفس میں بھی)۔

اسی طرح زندگی کو نیک قالب میں ڈھالنے کے لئے اس نے عقل کو قوموں کے تاریخی حقائق اور انسانی زندگی کی موجودہ صورتحال کی طرف متوجہ کیا۔ ارشاد خداوندی ہے: {قُلْ سِيرُوْا فِي الأَرضِ فَانظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِن قَبْلُ﴾(سورة الروم: ۴۲) ((اے نبی ﷺ) ان سے کہو کہ زمین میں چل کر پھر کر دیکھو پہلے گزرے ہوئے لوگوں کا کیا انجام ہو چکا ہے)۔ مزید فرمایا: {أُنظُرْ كَيْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُم عَلَى بَعضٍ وَلَلآخِرَةُ أَكْبَرُ دَرَجَاتٍ

وأكْبَرُ تفضِيلاً﴾ (سورۃ الاسراء: ۲۱) (دیکھ لو دنیا ہی میں ہم نے ایک گروہ کو دوسرے پر کیسی فضیلت دے رکھی ہے اور آخرت میں اس کے درجے اور بھی زیادہ ہوں گے اور اس کی فضیلت اور بھی زیادہ بڑھ چڑھ کر ہوں گی)۔

اس قرآنی توجیہ کے ذریعہ مسلمانوں میں فکر کی ایسی خاصیت کا نشوونما ہوا جس نے کائناتی اور انسانی حقیقت امر کو ہر معرفت کے لئے نقطہ آغاز بنا دیا۔ چنانچہ اس سے طبیعیاتی علوم پروان چڑھے جو تجرباتی طریقہ کا ثمرہ تھے۔ انسان کی نفسیاتی صورتحال کے مطالعہ سے علوم نفس کی نمود ہوئی۔ فقہی احکام کے علوم آگے بڑھے جو انسانوں کی زندگی میں جو کچھ حالات عادات اور رواج کی صورت میں تھا اس کو سامنے رکھ کر یہ طے کرتے تھے کہ کیا ہونا چاہئے۔ یہی حقیقت پسندی اس جدید تجرباتی طریقہ کی بنیاد بنی جس پر مغربی تہذیب کی بنیاد اس وقت پڑی جب راجر بیکن نے اسے اسلامی ارباب تجربہ سے منتقل کیا۔

یہ واضح ہے کہ حقیقت پسندی فکری وحدت کا ایک محرک ہے کیونکہ اسی کے ذریعہ معروضی حقیقت حال کے فیصلے کو قبول کیا جاتا ہے۔ اہل نظر کے درمیان حاصل شدہ آثار و نتائج پر مبنی مواد ایک ہو جاتا ہے اور نتائج میں اتفاق کا وسیع میدان سامنے آجاتا ہے۔

تصوراتی منہج بیشتر حالات میں نقطہ ہائے نظر کے شدید اختلاف کا سبب بنتا ہے۔ کیونکہ اس کا آغاز فرض کی ہوئی باتوں سے ہوتا ہے جس میں بہت دفعہ ذاتی رجحان کا بھی دخل ہو جاتا ہے۔ اہل یونان میں وجود اور کائنات کی اصل سے متعلق ان کے نظریات کی کثرت اس کا نمایاں مظہر ہے۔ جب ان کے تصوراتی منہج سے فارابی اور ابن سینا جیسے کچھ اسلامی مفکرین متاثر ہوئے تو انہوں نے اسلامی فکر میں اسکے عام حقیقت پسند دھارے سے ہٹ کر راہیں پیدا کر دیں۔ امت اسلامیہ میں گاہے گاہے ایسی جماعتیں ظاہر ہوتی رہتی ہیں جنہیں تصوریت اور مثالیت فکر میں منحرف کر دیتی ہے۔ وہ اصلاح کے سلسلے میں ایسے نقطہ نظر بناتے ہیں جو لوگوں کی

حقیقی صورتحال سے بالکل نامانوس ہوتے ہیں۔اورمحض اصولوں اورخواہشوں سے بنتے ہیں۔ چنانچہ یہ تحریکیں زیادہ تر امت میں اضطراب اور بے چینی کا ماحول جنم دیتی ہیں۔ ہمارا زمانہ بھی ایسی جماعتوں کے نمونوں سے خالی نہیں ہے۔

[د] تنقید

اس کا مطلب یہ ہے کہ عقل معرفت کے سفر میں ایسا مسلک اختیار کرے جس میں وہ باہم مقابل آرا کو جمع کرے،مختلف احتمالات میں تقابل کرے۔اوراس تقابل کی بنیاد پر ان کی جانچ اور پرکھ کرے۔ یہ موازنہ اور جانچ پرکھ فکر کو حق کی رسائی کے لئے صحیح راستہ دکھانے کا اہم محرک ہے۔

قرآن کریم اسلامی عقیدہ کو پیش کرتے ہوئے دماغوں کو تنقیدی صفت کی تربیت دیتا ہے ۔وہ بہت دفعہ اس صحیح عقیدے کا جسے وہ پیش کرتا ہے ان متضاد فاسد عقائد سے تقابل کرتا ہے جن کو لے کر ان کے حاملین جدال کرتے ہیں۔وہ دونوں عقیدوں میں موازنہ کرتا ہے پھر حق کو باطل سے پرکھ کر الگ کرتا ہے اور باطل کو حجت کی طاقت سے شکست دیتا ہے۔ملاحظہ ہو ارشاد باری تعالیٰ ہے: {وَقَالَتِ اليَهُودُ عُزَير ابنُ اللّٰه وقالَتِ النَصارَى المَسِيحُ ابنُ اللّٰهِ ذَلكَ قَولُهُم بأفْوَاهِهِم يُضَاهِئُون قولَ الذِينَ كَفَرُوا من قَبْلُ قَاتَلَهُم اللّٰه أنَّى يُؤْفَكون﴾(سورة التوبة :۳۰) (یہودی کہتے ہیں کہ عزیر اللہ کا بیٹا ہے اور عیسائی کہتے ہیں کہ مسیح اللہ کا بیٹا ہے۔یہ بے حقیقت باتیں ہیں جو وہ اپنی زبانوں سے نکالتے ہیں ان لوگوں کی دیکھا دیکھی جو ان سے پہلے کفر میں مبتلا ہوئے تھے خدا کی مار ان پر، یہ کہاں سے دھوکہ کھا رہے ہیں)۔

مزید فرمایا: ﴿وَاِذَا قِيلَ لَهُم اتَّبِعُوا مَا أنْزلَ اللّٰه قَالوا بَل نَتَّبِعُ مَا وَجَدْنَا عليه آبَائَنا أَوَلوْ كَانَ الشَّيطانُ يَدعوهُم الى عَذَابِ السَّعِير﴾(سورة لقمان: ۲۱)

(اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ پیروی کرو اس چیز کی جو اللہ نے نازل کی تو کہتے ہیں کہ ہم تو اس چیز کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔ کیا یہ ان ہی کی پیروی کریں گے خواہ شیطان ان کو بھڑکتی ہوئی آگ ہی کی طرف کیوں نہ بلاتا رہا ہو)۔

قرآن کی اس توجیہ سے مسلمانوں کے یہاں موازنہ اور تنقید کی صفت کا وجود ہوا اور اس کے ذریعہ انکے لئے ممکن ہوا کہ وہ پچھلوں کے علوم کا استیعاب کریں جو ان کے عقیدہ کے موافق ہو وہ بھی اور جو مخالف ہو وہ بھی۔ اور اس میں سے کسی چیز سے دوری بنائے بغیر انہیں بحث وتمحیص اور اسلامی تعلیمات سے تقابل کی بساط پر ڈال دیں۔ ا۔ پھر وہ انہیں تنقید کی کسوٹی پر پرکھیں ۔صحیح کو صحیح اور کھوٹے کو کھوٹا قرار دیں۔ ابوحامد الغزالی (ت ۵۰۵ھ) کی دونوں کتابوں 'مقاصد الفلاسفۃ' اور 'تہافت الفلاسفۃ' نیز امام ابن تیمیہ (ت ۷۲۸ھ) کی کتاب 'نقض المنطق' میں بالخصوص اور ان کی دوسری کتابوں میں جابجا ان کے رویے سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے۔

اور جب کسی بھی سبب سے بعض اسلامی گروہوں کے فکری افق میں تنگی پیدا ہو جاتی ہے اور ان کی عقلوں میں اپنے معتقدات کے خلاف رایوں کے لئے گنجائش نہیں بچتی ہے تو ان کے یہاں فکر ایک لکیر ہو جاتی ہے وہ پھر ایک ہی رائے کو ہضم کر پاتا ہے۔ پھر آگے بڑھ کر وہ مخالف کی رائے کو آنکھ بند کر کے رد کر دیتا ہے۔ اس کے سبب مسلمانوں میں رائے ٹھکرانے کا رجحان بنتا ہے اور انجام کار افتراق وانتشار پیدا ہوتا ہے۔ مسلمان خاص طور سے اپنی تاریخ کے عہد زوال میں جس تنگ مسلکی تعصب کا شکار ہوئے وہ اسی کا ایک مظہر ہے۔ ہمارے زمانے میں بھی یہ پوری طرح موجود ہے۔ آخری دہائی میں مسلکوں کو رد کرنے کی جو لہر واضح طور سے تیز ہوئی ہے اس سے بات اور واضح ہوتی ہے۔

[ھ] معروضیت

اس کا مطلب یہ ہے کہ عقل حقیقت کی جانب سفر کے دوران ان شخصی عوامل سے خالی ہو جائے جو اس کی حق شناس فطرت کو معطل کر دیتے ہیں۔ وہ زیر غور موضوع پر ایک مستقل خارجی

نتیجہ کی حیثیت سے نظر ڈالے۔اس کے اس بے لاگ مطالعہ سے اس کے ذاتی عناصر خود حقیقت تک لے جائیں گے۔

قرآن کریم ہمیشہ لوگوں کو دعوت دیتا ہے کہ وہ سوچتے وقت عقلوں کو ذاتی عوامل سے جو حقیقت کا حجاب بن جاتے ہیں آزاد کریں۔ان عوامل میں اہم ترین نفسانی خواہش ہے جس سے بار بار اور پر زور ممانعت آئی ہے ۔جیسے ارشاد باری تعالیٰ ہے :{فَلا تَتَّبِعُوا الهَوَى أن تعْدِلُوا﴾ (سورة النساء :۱۳۵) (لہذا اپنی خواہش نفس کی پیروی میں عدل سے باز نہ رہو)۔ مزید فرمایا:{فاحْكُم بَيْنَ النّاس بالحقِّ وَلَاتَتّبع الهَوى فيُضِلَّكَ عَن سَبيْلِ اللّٰه﴾(سورة ص: ۲۶) (لہذا تو لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ حکومت کر اور خواہش نفس کی پیروی نہ کر کہ وہ تجھے اللہ کی راہ سے بھٹکا دے گی)۔

اسی طرح آباء واجداد کی تقلید جس کی بہت شدید ممانعت اس قرآنی تمثیل میں ہے:

{وَ كَذَلكَ ما أرْسَلْنَا مِنْ قَبلِک فی قَرْيَةٍ مِن نَذِيرٍ اِلَّا قال مُتْرَفُوهَا اِنَّاوجَدْنَا آبَاء نا على أُمَّةٍ واِنَّا على آثَا رِهِم مُقْتَدُونَ۔قلَ أَوَلَو جِئْتُكم بأهْدَى ممَّا وجَدْتُم عَلَيه آبَاء كُم قَالُوا اِنّا بما أُرْسِلتم بِه كَافِرُون﴾ (سورة الزخرف :۲۳-۲۴) (اسی طرح تم سے پہلے جس بستی میں بھی ہم نے کوئی نظیر بھیجا،اس کے کھاتے پیتے لوگوں نے یہی کہا کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک طریقہ پر پایا ہے اور ہم انھیں کے نقش قدم کی پیروی کر رہے ہیں۔ہر نبی نے ان سے پوچھا،کیا تم اسی ڈگر پر چلے جاؤ گے خواہ میں تمہیں اس راستے سے زیادہ صحیح راستہ بتاؤں جس پر تم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے؟ انھوں نے سارے رسولوں کو یہی جواب دیا کہ جس دین کی طرف بلانے کیلئے تم بھیجے گئے ہو ہم اس کے کافر ہیں)۔

جب لوگ معرفت کے منہاج میں ذاتی عوامل سے دور ہو جاتے ہیں اور موضوع کے آثار ونتائج کے لحاظ سے خود موضوع سے فیصلہ چاہتے ہیں تو ان یکساں نقطہ نظر اور احکام تک پہونچتے ہیں

جوموضوع خود متعین کرتا ہے۔اور یہ چیز ان کے درمیان زندگی کے انتظام کی مشترک بنیاد تشکیل دیتی ہے۔مسلمانوں کی تاریخ کے بہت سارے ادوار میں خاص طور سے عروج کے زمانے میں مسلمانوں کی یہی صورتحال تھی۔وہ زندگی کی تنظیم کرنے والے بنیادی جیسے عبادت،معاملات اور سیاست شرعی سے متعلق فقہی اصولوں تک رسائی میں ایک ساتھ شریک تھے۔اور ان میں محض جزوی اور فروعی اختلاف ہوتا تھا اور وہ بھی ذاتی عوامل کے سبب نہیں بلکہ حاصل شدہ معلومات میں تفاوت کی وجہ سے ہوتا تھا۔مگر بعض ادوار میں ان پر ذاتی پیمانوں کی افتاد آپڑی جس نے ان کی فکری وحدت کو بڑی حد تک فساد سے دوچار کردیا۔اس کا سب سے نمایاں مظہر وہ کچھ ہے جو تصوف نے رائج کیا جب امت میں معرفت کے سلسلے میں کسی بھی قاعدے سے آزاد محض ذاتی خیال کو سند اور اعتبار کا درجہ دینے کا رجحان پھیل گیا۔آج بعض مسلم طبقوں میں ہم مغربی پیمانوں کی جو اندھی تقلید دیکھ رہے ہیں وہ ان کو صحیح معروضی نگاہ سے دور کررہی ہے اور اس طرح مسلمانوں کے بیچ انتشار وافتراق کی مختلف شکلیں پنپ رہی ہیں۔

یہ پانچ منہجی ارکان وہ ہیں جو ہمارے خیال میں مسلمانوں کی فکری وحدت کی تشکیل کرتے ہیں۔جب یہ ان کے ذہن میں راسخ ہوجائیں اور دماغوں کے مزاج میں شامل ہوجائیں تو وہ معاملات پر غور کرتے ہوئے،درپیش مسائل کا سامنا کرتے ہوئے اور تجاویز اور احکام طے کرتے ہوئے ان پانچ اصولوں سے تشکیل شدہ مشترک پلیٹ فارم سے اپنی کوششوں کا آغاز کریں گے۔پھر نتیجے اور اندازے بالکل یا قریب قریب یکساں ہوں گے اور اس کے نتیجہ میں عمل کا ارادہ بھی ایک جیسا ہوگا۔اسلامی عقیدہ اپنے وسیع مفہوم میں جیسا کہ قرآن کریم اور حدیث میں پیش کیا گیا ہے اس کی قدرت رکھتا ہے کہ اسلامی فکر کو ان پانچ اصولوں پر متحد کردے۔مگر اس کی منہجی وحدت سازتاثیر عمل کی دنیا میں نظر آئے اس کے لئے محرک شرطیں ناگزیر ہیں۔آزادی رائے بھی ایسی ہی ایک تحریک دینے والی چیز ہے۔

سوال یہ ہے کہ آزادی رائے فکری وحدت کا باعث کیسے بنتی ہے؟

فصل دوم :

آزادی رائے اور مسلمانوں کی فکری وحدت

۱-آزادی رائے

رائے معرفت کی خاطر عقل کے غور وفکر کو کہتے ہیں۔اسی طرح اس کا اطلاق ان چیزوں پر بھی ہوتا ہے جن کے یقین تک عقل غور وفکر کے بعد پہونچتی ہے۔(لسان العرب، القاموس مادۃ رأی) ہم اس سیاق میں رائے کا استعمال دونوں معنوں میں کریں گے۔معرفت کی تلاش میں عقل کی سعی وکاوش اور احکام کی صورت میں اس کاوش کے ثمرات۔

اس معنی کی رو سے جب رائے ایک ذاتی عمل ہے جو انسان اپنے اندرون میں انجام دیتا ہے، اور وہ اپنی عقل پر سوار ہو کر غور وفکر کی راہیں طے کرتے ہوئے معرفت کے حکم تک پہنچتا ہے۔ جب صورتحال یہ ہے کہ انسان اپنی رائے میں فطری طور سے آزاد معلوم ہوتا ہے کوئی اس کی اس آزادی کو اس سے چھین نہیں سکتا ہے۔تو پھر آزادی رائے سے کیا مراد ہے؟؟اس کا جواب یہ ہے کہ آزادی رائے کا مدلول جیسا کہ ہم اس سیاق میں استعمال کریں گے اور جیسا کہ عام استعمال میں رائج ہے انسان کے اپنی ذات سے تعلق کے ذاتی فاصلے سے آگے بڑھ کر بنیادی طور سے اجتماعی بعد رکھتا ہے جو دو اہم عناصر پر مشتمل ہوتا ہے۔

اول: غور وفکر کے طریقوں اور اسالیب میں انسان کی آزادی۔یعنی یہ نہ ہو کہ اس کو دوسروں کی طرف سے وہ دلائل اور معلومات دے دی جائیں جو اسے غلط فیصلے تک لے جائیں۔ یا اس کو متعین طریقہ ہائے فکر کو اختیار کرنے کا پابند بنایا دیا جائے جن سے پہلے سے طے شدہ نتیجہ

تک پہونچانا مقصود ہوخواہ وہ درست ہو یا نا درست ہو۔ اگر ایسی کوئی صورت ہے تو وہ آزادی رائے سلب کر لینے کی ایک صورت شمار ہوگی کیونکہ اس میں پہلے سے دوسروں کی جانب سے متعین رائے تک پہونچنے کی ہدایت ہوتی ہے۔ اور اگر صاحب نظر کو غور وفکر میں آزاد چھوڑ دیا جائے تو ہوسکتا ہے وہ اس رائے تک نہیں پہونچے بلکہ ممکن ہے وہ اس کے برعکس نتیجہ تک پہونچے۔

آزادی سلب کر لینے کا یہ طریقہ فرعون کا طریقہ ہے۔ اس نے اپنے درباریوں کو موسیٰؑ کے قتل پر ہم خیال بنانے کے لئے جمع کیا۔ مگر ایک مرد مومن نے جو وہاں موجود تھا ایسے دلائل پیش کئے جو قتل کو غلط قرار دے رہے تھے۔ فرعون نے درباریوں کی طرف گفتگو کا رخ کر کے اس کی بات یہ کہہ کر کاٹ دی کہ: {مَا أُرِيكُم اِلا ما أَرَى وَما أَهديكُم اِلّا سَبِيلَ الرَّشَاد﴾ (سورة غافر : ۲۹) (میں تو تم لوگوں کو وہی رائے دے رہا ہوں جو مجھے مناسب نظر آتی ہے اور میں اسی راستے کی طرف تمھاری رہنمائی کرتا ہوں جو ٹھیک ہے)۔

اس طرح مرد مومن کے دلائل کو ان سے دور کر کے اپنے دلائل کا انہیں پابند بنایا تا کہ وہ اسی نتیجہ تک پہونچیں جو وہ چاہتا ہے (تفسیر التحریر والتنویر ج ۲۴ ص ۱۳۳) اس فرعونی طریقے کی بہت ساری نظیریں ہم آج دیکھ رہے ہیں خاص طور سے گمراہ کن ذرائع ابلاغ جو کچھ کر رہا ہے۔

دوم: جس رائے تک انسان بحث ونظر کے ذریعہ پہونچتا ہے اس کا اعلان کرنے اسے لوگوں میں عام کرنے اور اس سے مطمئن کرنے اور اس کا دفاع کرنے کی آزادی۔ شاید آزادی رائے کی اہم تر صورت یہی ہے۔ اور رائج استعمال میں زیادہ یہی مراد ہوتی ہے۔ کیونکہ اس رائے کی کیا قیمت ہوسکتی ہے جو دل میں قید رہے اور زندگی کے بہاؤ میں اس کی کوئی تاثیر نہ ہو اور سماج اسے اختیار نہ کر سکے اور نہ اس پر عمل کر سکے؟۔ یہیں سے رائے میں آزادی کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ اس کا لوگوں تک پہونچنے کا راستہ ہر اس روڑے سے پاک ہو جو صاحب رائے کے اظہار میں رکاوٹ بنے یا رائے کے لوگوں تک پہونچنے میں رکاوٹ بنے یا رائے کو مضبوط کرنے

اوراس سے مطمئن کرنے کے وسائل میں رکاوٹ بنے اور اگر اس طرح کی کوئی بات ہوتی ہے تو وہ آزادی رائے کو مقید کرنا شمار ہوتی ہے۔

آزادی رائے میں ان ذاتی رکاوٹوں کا شمار بھی ہوتا ہے جو عقل کو حق تک پہونچانے والی معروضی نظر سے روکتی ہیں۔ بطور خاص خواہش نفس، رسم ورواج اور اگلوں کی تقلید۔ یہ سب آزادی فکر کے لئے بیڑیاں ہیں جو عقل کو پابجولاں کر کے انہیں نتائج کی راہ دکھاتی ہیں جو گویا ایک طرح سے پہلے سے طے شدہ ہوتے ہیں اگر پہلے اور دوسرے معنی میں آزادی رائے کا اندراج اجتماعی ذمہ داری کے ضمن میں ہوتا ہے تو اس معنی میں یہ فرد اور معاشرہ دونوں کی مشترک ذمہ داری ہے کیونکہ عادات وتقالید کو آزادی رائے کی بندش بنا دینے میں معاشرے کا مضبوط دخل ہوتا ہے۔

یہ جاننا بھی اہم ہے کہ آزادی صرف اس رائے تک محدود نہیں ہے جسے آدمی اپنے ذاتی غور وفکر سے ایجاد کرے۔ بلکہ اس سے آگے بڑھ کر اس میں وہ رائے بھی شامل ہے جسے انسان دوسرے سے لیتا ہے پھر اسے قبول کرتا اور اس سے اپنے اتفاق کا اظہار کرتا ہے اور اسے لیکر میدان میں اترتا ہے تاکہ اس سے لوگوں کو مطمئن کرے اور ان میں عام کرے۔ غرض یہ سب بھی آزادی رائے کے تحت ہی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ آزادی رائے کی بھی کچھ شرطیں اور منہجی ضابطے ہیں۔ مثلاً دستیاب معلومات اور حق تک پہنچانے والے راستوں میں صحیح تر کا انتخاب، مفاد عامہ کے مقصد میں اخلاص ورنہ وہ رائے مغالطے خودرائی اور دھوکہ دہی میں بدل جائے گی۔ اسی طرح اس کے اخلاقی حدود بھی ہیں مثلاً رائے منتقل کرنے اور بیان کرنے میں سچائی، اس سے مطمئن کرنے کے لئے بہتر اسلوب ورنہ وہ جھوٹ، دھوکہ، ہٹ دھرمی اور تہمت ودلآزاری ہوجائے گی۔ ایسی صورت میں وہ اس دائرے سے نکل جائے گی جو رائج استعمال میں اس کے لئے بنایا گیا ہے۔ ہم اس سیاق میں اسی آزادی پر گفتگو کریں گے جو ان حدود وضوابط کی پابند ہو۔

۲-آزادی رائے کے لئے شرعی بنیاد

اسلامی تعلیمات نے آزادی رائے کو مشروع صرف اس بنیاد پر نہیں کیا ہے کہ وہ مسلمان کے جائز حقوق میں سے ایک حق ہے۔ بلکہ اس بنیاد پر کہ وہ اس کی ذمہ داری بھی ہے۔ اور جتنی شدت سے اس کا مطالبہ آیا ہے اس سے ہم اسے مقاصد شریعت کے خانوں میں سے ضروریات کے خانے میں رکھ سکتے ہیں۔ گویا وہ شریعت کے مقاصد میں ایک ضروری مقصد ہے۔

سورۃ علق کی آیتوں کے ساتھ قرآن کریم جب پہلی بار نازل ہوا تو اس نے اسلامی عقیدے کے عظیم اصول بیان کئے جیسے اللہ کا وجود، کائنات کا آغاز اور اس کا انجام۔ ہم آزادی رائے کی تشریع کو بھی انہیں کے درمیان پاتے ہیں جو اس ارشاد باری میں شامل ہے: { أَرَأَيْت اَلّذی يَنهَی عَبْداً اِذَا صَلَّی ۔أَرَأَيْتَ اِنْ كانَ عَلی الهُدَی ۔أَوْ أَمَر بالتقوَی﴾(سورة العلق : ۹-۱۲)

(تم نے دیکھا اس شخص کو جو ایک بندے کو منع کرتا ہے جب کہ وہ نماز پڑھتا ہو۔ تمھارا کیا خیال ہے اگر (وہ بندہ) راہ راست پر ہو یا پرہیز گاری کی تلقین کرتا ہو؟)۔

یہ آیت انکار آمیز تعجب کے اسلوب میں ہے جو اپنے اندر اس کے لئے پھٹکار اور ممانعت لئے ہوئے ہے جو نبی ﷺ کو نماز سے روکتا ہے اس طرح ان کی عقیدہ اور عبادت کے سلسلے میں آزادی کو معطل کرتا ہے اور انہیں اس سے روکتا ہے کہ لوگوں کو نئے دین کا راستہ دکھائیں اور انہیں اس کے تقاضے یعنی تقوی کی طرف بلائیں وہ رائے کی تبلیغ اور اس سے مطمئن کرنے کی آزادی کے سامنے آڑ بن جاتا ہے۔ آزادی رائے کا اسلامی شریعت میں کیا مقام ہے یہ بتانے کے لئے اتنا کافی ہے کہ قرآن کے اولین نزول میں ہی آزادی رائے کا اصول درج کر دیا گیا (راجح قول کے مطابق اولین وحی کے کچھ عرصہ بعد نازل ہونے والی یہ پہلی آیتیں ہیں، دیکھئے التحریر والتنویر ۳۰۔۴۴۴)۔

اسلامی تعلیمات میں یہ بھی طے شدہ ہے کہ آزادی رائے ہی ایمان حقیقی تک پہنچنے کا معتبر دروازہ ہے۔ ایمان دین کے میزان میں ایمان کامل جبھی ہوگا جب وہ اس فکری آزادی پر مبنی ہو جو ذاتی تدبر کا موقعہ دے جس میں کوئی خارجی موثر خواہ وہ آبائی ورثہ ہو یا دوسروں کے مشورے اثر انداز نہ ہوں پھر وہ آزادی نظر پر مبنی اطمینان سے نوازے۔ اسی لئے عقیدہ کے بعض علماء نے مقلد کے ایمان کو ایمان نہیں شمار کیا ہے۔ اور بہتوں نے اسے ناقص ایمان قرار دیا ہے (اس سلسلے میں دیکھئے بغدادی کی اصول الدین ص ۲۵۴، لقانی کی شرح الجوہرہ ص ۳۶)۔

یہ تشریح آزادی رائے کے تیسرے معنی کی ہے، جس کا ہم نے پیچھے ذکر کیا ہے یعنی اسے معطل کر دینے

والی ذاتی رکاوٹوں سے آزادی، نفس پر آبائی ورثے کا تسلط بھی انہیں رکاوٹوں میں سے ہے۔

اسی طرح آزادی کے اس مفہوم کے لئے کہ وہ حالات، امکانات اور طریقے مہیا ہوں جو آزاد غور و فکر کو ممکن بنائیں اور اس کے منافی مسلط کردہ رکاوٹیں ختم ہو جائیں شریعت کا یہی انداز ہے قرآن کریم کہتا ہے کہ ایسا ماحول بنانا اور اس کی تلاش میں نکلنا واجب ہے۔ ارشاد باری ہے {اِنَّ الَّذِيْنَ تَوفَّاهُم المَلائكةُ ظَالِمِى أَنفسِهم قَالوا فيم كُنْتم قَالوا كنَّا مُستَضعَفِين فِى الأرض قَالوا أَلَم تَكُن أرض اللّٰه وَاسِعة فتُهَاجِرُوا فِيها فأولئكَ مأ وَاهُم جَهَنَّمُ وسَاءَ ت مَصِيراً﴾ (سورة النساء :۹۷) (جو لوگ اپنے نفس پر ظلم کر رہے تھے ان کی روحیں جب فرشتوں نے قبض کیں تو ان سے پوچھا کہ یہ تم کس حال میں مبتلا تھے؟ انھوں نے جواب دیا کہ ہم زمین میں کمزور و مجبور تھے فرشتوں نے کہا کیا خدا کی زمین وسیع نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کرتے؟ یہ وہ لوگ ہیں جن کا ٹھکانہ جہنم ہے اور وہ بڑا ہی برا ٹھکانا ہے)۔

اس آیت کے مفہوم میں یہ بھی ہے کہ وہ لوگ جو دار کفر میں قیام پر راضی ہوں باوجود اس کے کہ وہاں ایمان کے اساس پر زندگی کے امور مرتب کرنے کے لئے غور و فکر کی راہ میں رکاوٹیں ہوں چہ جائیکہ اس

سلسلے میں اپنی رائے کا اعلان کرسکیں اور وہ ان بندشوں سے آزاد ہونے کے لئے کوشاں نہیں ہوں اس طور سے کہ وہاں سے جگہ ہجرت کر جائیں جہاں آزادی فکر وانتظام کے لئے کشادہ ماحول موجود ہو، ایسے لوگ سزا کے مستحق ہوں گے۔

قرآن کریم نے رائے کے اعلان اور لوگوں میں اس کی تبلیغ کی آزادی کو امت کے قیام، اس کے تحفظ اور اس کی وحدت پذیری کے لئے اجتماعی بنیادوں میں سے ایک بنیاد قرار دیا ہے۔ ارشاد باری ہے: {وَلتَكُن منْكُم أمَّةٌ يَدعون الَى الخَيْرِ ويأمُرُونَ بالمَعرُوف وينَهَون عن المُنْكرِ وأولَئِک هُمُ المُفْلِحُون ۔ولاَتكُونوا كا لذِينَ تفَرّقُوا واخْتَلَفُوا من بعدِ ما جَاءَ هُم البَيِّنَات﴾(سورة آل عمران :۱۰۴-۱۰۵)

(تم میں کچھ لوگ تو ایسے ضرور ہونے چاہئیں جو نیکی کی طرف لائیں، بھلائی کا حکم دیں، اور برائیوں سے روکتے رہیں۔ جو لوگ یہ کام کریں گے وہی فلاح پائیں گے۔ کہیں تم ان لوگوں کی طرح نہ ہوجانا جو فرقوں میں بٹ گئے اور کھلی کھلی واضح ہدایات پانے کے بعد پھر اختلافات میں مبتلا ہوئے)۔

معروف کا حکم دینا اور منکر سے روکنا رائے کی تبلیغ اور اس کے لئے دلائل کی فراہمی کی آزادی ہی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے واضح کیا ہے کہ اس آزادی کو ختم کرنا یا اس کے سلسلے میں کوتاہ دست ہوجانا امت کی وحدت کو بھی پارہ پارہ کرے گا اور بندوں کے خدا سے تعلق کو بھی توڑ دے گا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: تم ضرور معروف کا حکم دو گے اور منکر سے روکو گے اور ظالم کا ہاتھ پکڑو گے اور اس کو حق پر موڑو گے ورنہ اللہ تمہارے دلوں کو آپس میں ٹکرائے گا پھر تم پکارو گے اور پکار سنی نہیں جائے گی (سنن ابی داوود)۔

عملی سطح پر بھی سیرت نبوی آزادی رائے کے مثالی نمونوں سے مالا مال ہے۔ عقل کو ذاتی بندشوں سے آزاد کرنا، باطل کی طرف موڑنے والی خارجی رکاوٹوں سے آزاد کرنا، اظہار

وتفہیم کے مواقع فراہم کرنا، سیرت کی کتابیں ان سب چیزوں کے اعلیٰ نمونوں سے لبریز ہیں۔

اسلامی شریعت نے آزادی رائے کو مشروع کرتے ہوئے ان ضمانتوں کے تذکرے کو بھی نظر انداز نہیں کیا جو اس انحراف کو روکیں جو آزادی رائے کو اس کے مزاج سے دور کر دیتا ہے اور جس کے سبب وہ مطلوبہ کردار نہیں ادا کر پاتی ہے بلکہ اس نے اسے جو بیک وقت حق بھی ہے اور فرض بھی ایسی بندشوں سے گھیر دیا جو اسے انحراف سے محفوظ رکھیں۔ ان میں سے کچھ منہجی بندشیں ہیں جیسے رائے بنانے اور لوگوں میں اس کا اعلان کرنے سے قبل تحقیق کے عمل کو اچھی طرح مکمل کر لینا۔ ارشاد باری ہے: {يَاأَيُّهَاالَذِينَ آمَنُواان جَاءَكم فَاسِقٌ بنَبا فتَبَيَّنوا أن تُصِيبوا قوماً بجَهالَةٍ فَتُصْبِحُوا عَلى مَا فَعَلتُم نَادِمين﴾ (سورة الحجرات:٦) (اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو اگر کوئی فاسق تمھارے پاس کوئی خبر لے کر آئے تو تحقیق کر لیا کرو، کہیں ایسا نہ ہو کہ تم کسی گروہ کو نادانستہ نقصان پہنچا بیٹھو اور پھر اپنے کیے پر پشیمان ہو)۔

دوسرے مقام پر ہے: {وَاِذَا جَاءَ هُم أمْرٌ من الأمْنِ أو الخَوْفِ أذَاعوا بِهِ ولَوْ رَدُّوه الى الرَّسُول وَالى أولِى الأمْرِ مِنهم لعَلِمهُ الذِينَ يَسْتَنبِطُونَه مِنْهم﴾ (سورة النساء :٨٣)

(یہ لوگ جہاں کوئی اطمینان بخش یا خوفناک خبر سن پاتے ہیں اسے لے کر پھیلا دیتے ہیں، حالانکہ اگر یہ اسے اور اپنی جماعت کے ذمہ دار افراد تک پہونچائیں تو وہ ایسے لوگوں کے علم میں آجائے جو ان کے درمیان اس بات کی صلاحیت رکھتے ہیں کہ اس سے صحیح نتیجہ اخذ کر سکیں)۔

اور رائے کی تفہیم میں عمدہ اور خوبصورت رویہ اختیار کرنا۔ ارشاد باری ہے: {اِذْهَبَا اِلَى فِرعَون اِنَّه طَغَى. فَقُولاَ لَهُ قَولاً لَيِّناً لعَلَّهُ يَتَذَكَّرُ أو يَخْشَى﴾(سورة طه: ٤٣-٤٤) (جاؤ تم دونوں فرعون کے پاس کہ وہ سرکش ہو گیا ہے۔ اس سے نرمی کے ساتھ بات کرنا، شاید کہ وہ نصیحت قبول کرے یا ڈر جائے)۔

کچھ بندشیں اخلاقی ہیں جیسے دلآزاری اور تہمت درازی سے باز رہنا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے : {اِنَّ الَّذِیْن یَرْمُونَ المُحْصَنات الغَافِلات المُؤمِنات لعنوا فی الدُّنیا والآخرة ولَهُم عَذابٌ عظیم ﴾سورة النور: ۲۳) (جولوگ پاک دامن، بےخبر، مومن عورتوں پر تہمتیں لگاتے ہیں ان پر دنیا اور آخرت میں لعنت کی گئی اور ان کے لئے بڑا عذاب ہے)۔

تعریف کرتے ہوئے منافقت نما مبالغہ آرائی سے پرہیز کرنا۔ نبی ﷺ نے ایک آدمی سے کہا جس نے وہاں موجود ایک شخص کی تعریف کی: خبردار تم نے تو اپنے ساتھی کی گردن کاٹ ڈالی۔ آپ ﷺ نے یہ بات بار بار دہرائی۔ پھر کہا: جس کے لئے اپنے بھائی کی تعریف ناگزیر ہو وہ یوں کہے: فلاں شخص مجھے ایسا اور ایسا لگتا ہے اور اللہ اس سے باخبر ہے اور اللہ کے سامنے میں کسی کی تعریف نہیں کرتا ۔ وہ بھی اگر اسے اس کے بارے میں واقفیت ہو (صحیح بخاری)۔

اب تک کی گفتگو سے واضح ہوا کہ اسلامی شریعت میں آزادی رائے کے اصل مقصود اور ان ضمانتوں کی مشروعیت جو اس مقصود کی حفاظت کریں دراصل ایک ایسے اصول کی مشروعیت ہے جس کا اہم ترین مقصد ہمہ گیر اسلامی وحدت کی حفاظت ہے جس میں فکری وحدت بھی شامل ہے۔ اور آزادی رائے مسلمانوں کی فکری وحدت کو یقینی بنائے اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ ان پانچوں منہجی صفات کی تکمیل ہو جنہیں ہم نے فکری وحدت کے ارکان قرار دیا۔ ہم آگے یہ بتائیں گے کہ آزادی رائے مسلمانوں کی فکری وحدت کے حصول کے لئے ان تمام ارکان کی تکمیل کس طرح کرتی ہے۔ ہم یہ وضاحت کرتے چلیں کہ ہمارا طریقہ دو عناصر پر مشتمل ہوگا۔ آزادی رائے مسلمانوں کے درمیان جب رائج سنت بن جائے تو ذہنوں کی تربیت کس طرح ان منہجی اوصاف پر کرتی ہے جو فکری وحدت کے ارکان بھی ہیں، اس کی نظریاتی توضیح۔ اور اسلامی امت کی تاریخ

اورموجودہ صورتحال سے اس کے لئے کیا شہادتیں ملتی ہیں، ان سے استشہاد۔

۳-آزادی رائے اور نگاہ کی ہمہ گیریت

انفرادی اور اجتماعی دونوں ہی میدانوں میں آزادی رائے سے ہمہ گیریت کی صفت وجود پذیر ہوسکتی ہے۔ یہ ہمہ گیریت اس میں بھی ہوتی ہے کہ معرفت کے جملہ مواد پر نگاہ حاوی ہو اور اس میں بھی کہ پیش آمدہ مسائل نیز ان خاص مسائل کے جن کی حقیقت سے پردہ اٹھانا مقصود ہے، تمام دستیاب مالہ وماعلیہ کو اکٹھا کیا جائے۔

جب انسان ذاتی رجحانات سے آزاد ہوجاتا ہے جو عقل کو پہلے سے طے شدہ نتائج کی طرف موڑ دیتے ہیں جیسے آبائی رسم ورواج اور خواہشات کا تسلط اور جب وہ خارجی موثرات سے بھی آزاد ہوجاتا ہے جو اسے متعین مالہ وماعلیہ یا تلاش کے متعین طریقہ کا پابند کردیتے ہیں اس وقت وہ بلا قید وبند پرواز کرتا ہے۔ مختلف چیزوں میں سے ہر وہ چیز جمع کرلیتا ہے جو جادہ حق روشن کرنے میں معاون ہوسکتی ہو۔ ہر وہ طریقہ اور اسلوب اختیار کرتا ہے جو علم تک پہنچادے، وہ جب غور وفکر کا آغاز کرتا ہے تو بہت ساری راہیں اس کے ذہن کے سامنے وا ہوجاتی ہیں وہ ان سے غور وفکر کیلئے موزوں سرمایہ اور صحیح حکم تک پہنچانے والی شہادتیں چن لیتا ہے۔

اسی طرح جب رائے کا اعلان اس کی تبلیغ اور اس کے دفاع کے مواقع میسر آجاتے ہیں تو آسانی سے مذاکرات کا ماحول وجود میں آتا ہے جس میں رایوں کا تقابل ہوتا ہے۔ دلائل میں زور آزمائی ہوتی ہے اس طرح وہ راہیں اور وہ نتائج وآثار بے پردہ ہوجاتے ہیں جو غفلت کے پردے میں پوشیدہ یا کسی بھی سبب سے مخفی رہ گئے ہوتے ہیں چنانچہ عقل ان معلومات میں اضافہ کرتی ہے جنہیں اکٹھا کرکے غور وفکر میں اس پر اعتماد کیا ہوتا ہے اور بسا اوقات نتیجہ میں بھی تبدیلی کرتی ہے اور کبھی تو بالکل نئے احکام تک پہنچتی ہے۔

ان ساری چیزوں سے ذہنوں کی ایسی تربیت ہوتی ہے کہ وہ اپنی معرفت کی کوششوں

میں ہمہ گیر رہیں۔حق تک پہونچانے کی معلومات کے ایک میدان میں ان کا ملاپ ہوتا ہے اور حق تک لے جانے والے راستوں میں ان کا سنگم ہوتا ہے۔اس کے بالمقابل تینوں میں سے کسی بھی سطح پر آزادی پر بند عقل کی حرکت کو معلومات وحقائق کے کسی ایک خاص طرز تک محدود کر دیتا ہے اور اسے لگے بندھے متعین رخ پر چلنا ہوتا ہے۔چنانچہ اس کا غور وفکر بھی جزوی ہو کر رہ جاتا ہے۔اور پھر نتائج میں بھی بہت زیادہ اختلاف ہو جاتا ہے۔پھر جب اظہار ومباحثہ کی آزادی ختم ہو جاتی ہے تو ذہن اپنی جزوی کوشش پر ہی رک جاتے ہیں۔ارتقاء کے راستے بند ہو جاتے ہیں اور تصحیح ونظر ثانی کے مواقع ختم ہو جاتے ہیں جس کے بعد پھر افتراق ومنافرت میں اضافہ ہوتا ہے۔

رسول ﷺ اپنے ساتھیوں میں آزادی رائے کو پروان چڑھاتے تھے۔وہ اسے مہمیز دیتے تھے تاکہ صورتحال کا سامنا کرتے ہوئے ان کے اندر ہمہ گیر نگاہ کا وصف ابھر کر آئے جو فیصلہ لینے میں وحدت کا سبب بنے۔بہت دفعہ وہ کسی مسئلے کے حل کے لئے صحابہ کو جمع کرتے ان سے ان کی آراء مانگتے اور ان سے اس کے لئے اصرار کرتے۔مسئلے کے مالہ وماعلیہ پر بھرپور مواد جمع ہو جاتا اور اس کے حل کے سلسلے میں زیادہ سے زیادہ طریقے سامنے آجاتے۔یہاں تک کہ آخر میں صحیح موقف واضح ہو جاتا اور اس پر سب متفق ہو جاتے۔اسکی سب سے نمایاں مثال یہ ہے کہ: غزوہ بدر سے پہلے آپ ﷺ نے وسیع پیمانے پر مشورہ کیا کہ قریش جنگ کرنا چاہتے ہیں ایسے میں کیا موقف اختیار کرنا چاہئے؟ آپ ﷺ نے صحابہ کو جمع کر کے طویل گفتگو کرائی یہاں تک کہ سب جنگ کے فیصلے تک پہونچ گئے۔میرے خیال میں نبی ﷺ کی یہ مشاورتی کارروائیاں مسلمانوں میں آزادی رائے کی تربیت کے لئے ہوتی تھیں تاکہ ہمہ گیر نظر ان کی فطرت میں شامل ہو جائے ورنہ آپ ﷺ کو تو وحی کے ذریعہ صحیح فیصلہ بتا ہی دیا جاتا تھا۔

عملی سطح پر دیکھیں تو آزادی رائے قرون اولی میں عام طور سے رائج تھی۔فقہی مسالک

اور کلامی مسالک کی کثرت اس پر گواہ ہے۔ ساتھ ہی ہر زمانے میں مسلسل سیاسی کشمکش بھی اس پر شاہد ہے۔ باوجود اس کے کہ اس سے سیاسی افتراق پیدا ہوا جس کا سبب خود آزادی رائے نہیں بلکہ اس کی اخلاقیات میں کوتاہی تھی مگر اس آزادی نے اسلامی ذہن میں عام طور سے ہمہ گیر نگاہ معرفت کی منہجی خاصیت کو پیدا کیا جس کی نظیر دوسری تہذیبوں میں شاید ہی ملے۔ اس کے مصداق کے طور پر دیکھئے کس طرح اس عہد میں ممکنہ انسانی معرفت سے اسلامی دماغ نے فکر کا مواد حاصل کیا اور کسی بھی چیز سے بیزاری کے بغیر اسے حق تک رسائی کے راستے میں استعمال کیا۔ یہ بھی دیکھئے کہ کس طرح عقل نے اپنے دروازے ان تمام دلائل کے لئے کھول دئے جو اس وسیع مذاکراتی تحریک میں سے جس میں مسلم اور غیر مسلم سب شامل تھے ہر سمت سے برآمد ہو رہے تھے۔ اصولی طور سے ان میں سے کسی کو رد نہیں کیا جا رہا ہے۔ اس طرح اسلامی دماغ کو بے حد وحساب سرمایہ فکر حاصل ہوا۔

اگر چہ اس عام ماحول کی ہلچل میں جو آزادی سے بھرپور تھا کبھی کبھی کچھ منفی چیزیں بھی رونما ہو جاتی تھیں تاہم معرفت کی نظر میں ہمہ گیریت کی صفت سے مسلمانوں میں ایک طرح کی فکری وحدت وجود میں آئی جسے ہم دین پسندی کے اس عام رجحان میں دیکھ سکتے ہیں جس کی چھاپ اسلامی ثقافت پر پڑی تھی جو تمام اسلامی علوم پر نمایاں ہے یہاں تک کہ کائناتی علوم پر بھی بلکہ اس سے آگے بڑھ کر تمدنی تخلیقات جیسے شہروں، عمارتوں وغیرہ پر بھی۔ اسی طرح ہم اسے دیکھ سکتے ہیں اسلامی اقدار مخالف گزشتہ تہذیبوں اور مذاہب کے اثرات کی عام روک تھام کے رجحان میں بھی جس کی بہترین تعبیر امام غزالیؒ نے کی جب وہ یونانی فکر کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

میں ان پر اعتراض کروں گا تو میری حیثیت مدعی کی نہیں ہوگی جسے اپنا دعوی ثابت کرنا ہو بلکہ میری حیثیت دعوے کے منکر کی ہوگی جو دلیل کا مطالبہ کرے۔ وہ جو بھی اعتقاد رکھتے ہیں میں ان کا مختلف الزامی طریقوں سے قطعیت کے ساتھ ابطال کروں گا۔ کبھی معتزلہ کے مسلک

سے تو کبھی کرامیۃ کے مسلک سے اور کبھی واقفیہ کے مسلک سے۔ میں کسی خاص مسلک کی طرف سے دفاع میں نہیں اٹھوں گا بلکہ امت کے سارے فرقوں کو ایسا کروں گا گویا ایک ہو کر ان پر ٹوٹ پڑے ہیں۔ کیونکہ یہ سارے فرقے ہم سے تفصیلات میں ہوسکتا ہے اختلاف رکھتے ہوں مگر وہ تو دین کے اصولوں میں ٹکراتے ہیں پس ان کے خلاف ہم سب ایک دوسرے کی مدد کریں گے۔ کیونکہ مصیبتوں کے وقت دشمنیاں ختم ہوجاتی ہیں۔(تھافت الفلاسفۃ ص ۸۲، ۸۳) یہ فکری وحدت جسے غزالی نے یونانی فلسفے سے مناظرے کے دوران فائدہ اٹھاتے ہوئے تسلیم کیا۔ وہ دراصل نظر کی اس ہمہ گیریت کے باعث پیدا ہوتی تھی جو اسلامی فکر کے مزاج میں شامل ہوگئی تھی۔ کیونکہ وہ تمام فرقے جن کا ذکر غزالی نے کیا ان کے یہاں دوسروں کے افکار وعقائد اور دلائل کے لئے کشادگی تھی اور یہی جواز بنا کہ ان کے نقطہ نظر اور خیالات سے اس میدان میں غزالی کے ذریعہ فائدہ اٹھایا جائے۔

مسلمانوں کی فکری تاریخ میں بخوبی غور کرتے ہوئے واضح ہوتا ہے کہ جب بھی کسی زمانے یا مقام یا کسی خاص گروہ میں آزادی رائے کا گلا گھونٹا گیا تو انجام کار احکام ومعارف جن راہوں اور جس سرمائے پر استوار ہوتے ہیں ان کا دائرہ بھی گھٹن کی حد تک تنگ ہوگیا۔ اور وہ جزوی ذہنیت وجود میں آئی جو صرف انتشار وافتراق کو جنم دیتی ہے۔ مثال کے طور پر زوال کی صدیوں میں فقہی اجتہاد کو گھٹن میں قید کردینے کے رجحان کو لیں۔ جس نے فقہاء کی عقلوں کو گذرے ہوئے فقہاء کے اقوال کے سرمایہ الفاظ میں محدود کردیا اور مسلمانوں کی زندگی میں ہونے والے واقعات کے مواد میں غور وفکر کے میدان سے انہیں دور کردیا۔ بلکہ قرآن وحدیث کے لفظی سرمائے سے بھی انہیں دور کردیا۔ چنانچہ فقہی وہ صورت بنی جو جزوی رایوں اور فرضی حلوں کا انبار ہے۔ مسلمانوں کی زندگی کو تہذیب سازی کی سمت متحدہ رخ کی رہنمائی کرنے میں وہ بہت کم مفید ہے۔ اس کی مثال غلو آمیز تصوف کا رجحان بھی ہے جس کے ماننے والوں نے

روحانی معلومات پر اکتفا کرلیا۔ وہ شیخ کے اقوال اور موقف کے پابند ہوگئے۔ ان سے یہ آزادی چھین لی گئی کہ دوسروں کی رایوں اور تمام تر تجربات کو بھی اور اس سرمایہ معلومات کو بھی دیکھیں جو عام زندگی کی صورتحال سے وجود پذیر ہورہا ہے۔ چنانچہ ان کے احکام ذاتی اور جزوی نوعیت کے ہوتے ہیں وہ عام قاعدہ بننے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ غرض جس قدر آزادی رائے تنگ ہوگی۔ دماغوں کی حرکت بھی تنگی سے دوچار ہوجائے گی اور ایسے جزوی نتائج نکل کر آئیں گے جو عام زندگی کی رہنمائی کے لئے موزوں نہیں ہوں گے۔

۴-آزادی رائے اور وحدت سازی

آزادی رائے وہ موزوں ماحول ہے جس میں عقل کی نشوونما غور وفکر میں رابطہ بندی اور وحدت سازی کی صفت پر ہوتی ہے۔ وہ اس لئے کہ عقل پر سے جب وہ بیڑیاں ہٹالی جاتی ہیں جو انسان کی ذات یا اس کے خارج سے اسے بوجھل کئے ہوتی تھیں۔ تو اسے وسیع اڑان میں اپنے فکری مواد کے مثل سے مثل تک اور شبیہ سے شبیہ تک جانے کے مواقع ملتے ہیں جس میں بالآخر اسے مماثلت ومشابہت کے مشترک اسباب وعلل کا ادراک ہوتا ہے اور وہ تجزیہ وتشریح میں رابطہ بندی اور وحدت سازی کا مسلک اختیار کرتی ہے۔ اس کے باعث اس کے اندر رابطہ بندی کا ایک وصف پیدا ہوجاتا ہے جس کے ذریعہ وہ ان حقیقی اسباب تک جا پہونچتی ہے جو مظاہر میں کثرت کی تفسیر کرتے ہیں اور ان کے ذریعہ وہ رایوں اور احکام کا رخ متحدہ غایت کے حصول کے لئے کردیتی ہے۔

ہاں اگر عقل کی رہنمائی وہ خواہشات یا تقلید کرے جو اس پر مسلط ہے یا پہلے سے طے شدہ نتائج تک پہنچنے کے لئے عقل کو جو متعین خوراک دے دی گئی ہے اس کے ذریعہ اس کی رہنمائی ہو تو اس وقت وہ اس رخ پر سوچے گی جس رخ پر ہانکی گئی ہے اسے دی گئی خوراک کے بقدر صرف قریب کے اور محدود اسباب نظر آئیں گے۔ اسے غایت بھی بس اسی قدر دکھائی دے

گی ۔ پھر اسے غور وفکر کے لئے جو مواد دیا گیا ہے اسی میں حرکت کر سکے گی ، وہ بھی چونکہ ایک دوسرے سے الگ بکھرے ہوئے جزیروں کی طرح پراگندہ ہوگا اس لئے ان کے مشترک روابط کا ادراک بھی اسے نہیں ہو سکے گا۔ اور وہ انہیں مشترک غایتوں کی طرف لے جا بھی نہیں سکے گی ۔ اس بات کی وضاحت کے لئے ہم دو مثالیں ذکر کرتے ہیں:

پہلی مثال: قرآن کریم میں قوم فرعون کی ذہنیت بیان کی گئی ہے۔ فرعون اور اس کے کاہنوں نے اس کی آزادی چھین لی تھی اور اسے ایسی رہنمائی کرتے تھے جو اس خدائی کی خدمت کرے جس کا فرعون اپنے لئے دعویدار تھا۔ وہ اس کا مخالف فکری مواد اس سے روک رکھتے تھے۔ اس نے عوامی ذہنیت کی تشکیل اس طرح کی کہ وہ واقعات کو الگ الگ سمجھے اور حقیقی متحد اسباب تک پہنچ جانے کے لئے وحدت سازی اور رابطہ بندی میں کوتاہ رہے۔ اللہ تعالیٰ اسے یوں بیان کرتا ہے: {وَلَقَد أَخَذْنَا اٰلَ فرعَون بالسِّنِين ونَقْصٍ منَ الثَمَراتِ لعَلَّهم يذَّكَّرُون فاذَا جَاءتْهم الحَسَنةُ قَالوا لنَا هذِه ،وإنْ تُصِبْهم سَيِّئَةٌ يطَّيَّرُوا بمُوسى وَمَنْ مَّعَه، أَلَا إنَّما طَائِرُهم عند اللّٰه ولكنَّ أَكْثَرهُم لايعلَمُون}(سورة الاعراف: ۱۳۰ – ۱۳۱)

(ہم نے فرعون کے لوگوں کو کئی سال تک قحط اور پیداوار کی کمی میں مبتلا رکھا کہ شاید ان کو ہوش آئے ۔ مگر ان کا حال یہ تھا کہ جب اچھا زمانہ آتا تو کہتے کہ ہم اسی کے مستحق ہیں، اور جب برا زمانہ آتا تو موسی اور اس کے ساتھیوں کو اپنے لئے فال بد ٹھیراتے ، حالانکہ درحقیقت ان کی فال بد تو اللہ کے پاس تھی مگر ان میں سے اکثر بے علم تھے)۔

آل فرعون قحط اور خوشحالی کے مظاہر قدرت کو اپنی پراگندہ ذہنیت سے سمجھتے تھے۔ وہ خوش حالی کو اپنے اعمال سے منسوب کرتے تھے اور قحط کو موسی اور ان کے ساتھیوں کی بدشگونی سے منسوب کرتے تھے۔ ابن عاشور اس سلسلے میں کہتے ہیں: وہ یہ سمجھے کہ ان کے درمیان کسی ایسے کا وجود جو ان کے دین کا مخالف ہو ان کے اوپر مصیبتوں اور نقصانات کا سبب بنتا ہے اس لئے وہ ان

سے بدشگونی لیتے تھے۔ وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ مصیبتوں کا سبب خود ان کا کفر اور اعراض ہے یہ گمراہی اور اندھے پن کا مجموعہ ہے۔ اس طرح وہ حقیقی اسباب کی معرفت سے فرار رہتے ہیں۔ اور اسی لئے بدشگونی اہل شرک کی نشانیوں میں سے ہے۔ کیونکہ اس کی بنیاد اس پر ہے کہ مسببات کو غلط اسباب سے منسوب کیا جائے۔ اور یہ مذہب شرک اور اس کے توہمات کے خالقوں کی ایجاد ہے۔ (التحریر والتنویر ۹۔۶۶)

دوسری مثال: آج ہم مغربی میڈیا کو دیکھتے ہی جس پر سپر پاور طاقتوں کا قبضہ ہے۔ یہ ادارے خبر رساں ایجنسیوں کے ذریعہ علاقائی اور عالمی واقعات خاص رنگ کے ساتھ محدود بنا کر پیش کرتے ہیں جس سے لگتا ہے کہ یہ صرف علاقائی واقعہ تھا جس سے دوسرے واقعات کا تعلق نہیں۔ عالمی سطح پر قابض ان ذرائع ابلاغ کی ذہن سازی کے نتیجہ میں عوام بھی ہر واقعہ کو علاقائی اسباب سے جوڑ دیتے ہیں۔ ان تمام کو اگر وہ جمع کر کے دیکھتے تو انہیں اسباب میں یکسانیت نظر آتی اور وہ سمجھتے کہ ان کا حقیقی سبب صرف ایک اور وہ بڑی طاقتوں کی آمریت ہے۔ جو عالمی واقعات کی ذمہ دار ہوتی ہیں مگر انہیں اپنے مفاد میں علاقائی حالات سے جوڑ دیتی ہیں۔ یہ ذہنیت آج عام طور سے حکمراں ہے کیونکہ آزادی پر پردہ پڑ گیا ہے۔ اور وہ آزادی جبھی ملے گی جب فکری مواد پورا کا پورا بغیر نگاہ بندی کے پیش کیا جائے۔

اعلان اور مباحثہ کی سطح پر بھی آزادی رائے کا یہی معاملہ ہے جب لوگوں کے بیچ وہ آزادی مہیا ہو جو گفتگو کا محرک بنے اور جہاں رایوں میں زور آزمائی ہو، دلائل میں زندگی کی لہر دوڑے، مباحثہ متفقہ پیمانے اور ترازو نصب کرائے، بحث میں شریک لوگ اس کے فیصلے کو دیکھیں تب مسائل اور واقعات میں غور کرتے ہوئے ذہنوں کی بنا میزان کی وحدت پر استوار ہوگی لیکن اگر عقلیں اپنی رایوں کے ساتھ اپنی ذات کے خول میں بند ہو جائیں تو وہ داخلی پیمانوں پر پروان چڑھیں گی اور تجزیہ اور توجیہ کی کسوٹی کی وحدت کے بغیر ان کا تلاش حق کا سفر ادھورا

رہے گا۔

نبی ﷺ نے اپنے ساتھیوں کی آزادی رائے کی مختلف سطحوں پر تربیت کی تھی۔ یہ تربیت واقعات کی تفسیر اور احکام کے اثبات میں ان کی عقلوں کو وحدت سازی اور رابطہ بندی کی صفت پر ڈھالتی تھی۔ جس کے ذریعہ انہوں نے وسیع الاطراف اسلامی زندگی کو اس طرح بنایا کہ اس کا رخ مقصد کی یکسوئی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی جانب ہو۔ اسی ذہن کے ساتھ قرآن کریم کا مختلف مراحل میں جمع کا کام ہوا جو بالآخر تمام مصاحف کو ایک مصحف عثمانی میں ضم کر دینے پر اختتام پذیر ہوا اور وہ سارے مسلمانوں کا مصحف بنا دیا گیا۔ اور اسی ذہن سے عمر بن خطابؓ نے اپنے عہد میں اسلام کے انتظامی سسٹم کا بیج ڈالا جو دین کی کسوٹی پر سلطنت کے انتظام کو امت کی خدمت کے لئے یکسو کر دے۔ غرض سارے ہی امور میں صورت حال یہی تھی۔

امت اسلامیہ کا ذہن عام طور سے اسی رخ پر تیار ہوا تھا۔ یہ منہج میں بھی یکسو ذہن تھا جس طرح عقیدہ میں یکسو تھا۔ آزادی رائے نے جو خاص طور سے دور اول میں عام تھی اسلامی فرقوں اور مذاہب کے درمیان داخلی مذاکرات کا اور دیگر تہذیبوں اور مذاہب والوں کے ساتھ خارجی مذاکرات کا بڑا موقعہ دیا تھا۔ اس نے عام طور سے مسلمانوں کے ذہنوں کی تشکیل اس ہیئت پر کی کہ مختلف مظاہر کے مشترک اسباب وعلل تک ان کی رسائی ہو۔ اور وہ فکری اور عملی ایجادات کو ہم آہنگ کریں تا کہ انہیں دین کی خدمت کے لئے جو کہ متحدہ غایت ہے یکسو کریں۔ علوم کے میدان میں بھی یہ چیز ان متعدد نئے علوم کی ایجاد میں واضح ہوتی ہے جو عام قانونی رنگ لئے ہوئے ہیں۔ جیسے اصول فقہ کا علم، نقد شعر کا علم اور ابن خلدون کا سماجی علم۔

اسلامی تاریخ کے مختلف حصوں میں آزادی رائے کا رقبہ جس قدر تنگ ہوا یہ منہجی خاصیت بھی اسی قدر سکڑ گئی۔ اولین اسلامی دور میں جب آزادی رائے کا خوب دور دورہ تھا۔ وحدت سازی کی خاصیت بھی پورے آب وتاب پر تھی۔ پانچویں صدی کے بعد جب منتشر

سلطنتوں میں سیاسی استبداد سخت ہوا، ساتھ ہی اجتہاد کا دروازہ بند ہونے اور صوفی رجحان کے عام ہونے سے فکری بحران میں اضافہ ہوا۔ تو وحدت سازی کی خاصیت کو بھی زوال آیا۔ چنانچہ بہت سارے علماء ومفکرین کی کتابیں معرفت کی جزئیات وفروعات میں غرق نظر آنے لگیں ان میں وہ کلی وحدت ساز تنظیر کا وجود نہیں تھا جس طرح کہ اولین ادوار میں تھا۔ علم فقہ میں شروحات وحواشی کا دور آیا گیا جبکہ پہلے اس کا کام زندگی کی اس طرح اسلامی تشکیل کرنا تھی کہ وہ اللہ کی طرف یکسو ہوجائے۔ علم کلام میں جگالی اور لفظی بحثوں کا دور آ گیا جب کہ پہلے وہ عمومی انسانی معرفت سے مواد لے کر اسلامی عقیدہ کی تعلیمات کے ساتھ انہیں ایک دلیل کی وحدت میں ڈھالنے کا علم تھا تا کہ عقیدہ کا اثبات ہو اور اس سے شبہات کو دور کیا جائے۔ مفتاح السعادۃ کے مصنف نے اس بات کو بہترین انداز سے بیان کیا جب انہوں نے یہ بتایا کہ عقیدہ کا علم علوم کی وسعت کے ساتھ وسیع ہوتا جاتا تھا۔ مسلمان جب کسی نئے علم سے واقف ہوتے اس میں سے مطلوبہ مواد نکل کر علم عقیدہ کے موضوع میں ضم کر دیتے اور استدلال میں اس سے کام لیتے تھے۔

۵- آزادی رائے اور حقیقت پسندی

کائنات کے مظاہر اور گذرتی ہوئی زندگی کے واقعات کی صورتحال انسان کے ذہن سے وہ قریب ترین چیز ہوتی ہے جہاں سے وہ اپنے معرفت کے سفر کا آغاز کرتا ہے۔ اگر عقل کو اس کی فطرت پر آزاد چھوڑ دیا جائے تو وہ از خود فطرت اور زندگی کی صورتحال میں غور کرنے کے لئے متوجہ ہوجائے گی۔ اس کی فطرت اسے از خود متوجہ کرے گی کہ وہ دوسروں سے ان امور کے سلسلے میں بحث اور گفتگو کرے جو مشترک واقعات کے رونما ہونے سے اسے اور انہیں درپیش ہوتے ہیں۔ غور وفکر میں حقیقت پسندی کی خاصیت تک عقل اس آزادی رائے کے ذریعہ پہنچتی ہے جس کے فطری تقاضوں میں یہ خاصیت شامل ہے۔ اسی سے اس کی بھی توجیہ ہوتی ہے کہ کس طرح دیہات کے لوگ جو ان بندشوں سے آزاد ہوتے ہیں جو سماجی تعلقات کی پیچیدگیوں سے

رونما شہری زندگی کے تقاضے دماغوں پر مسلط کرتے ہیں، مہذب شہریوں سے زیادہ حقیقت پسندانہ نگاہ کے حامل ہوتے ہیں۔ اور اس کا واضح مصداق ہے کہ جب اسلام آیا تو عرب بدویت کے غلبہ کے باعث حقیقت سے زیادہ قریب تھے یونانی، ایرانی اور ہندوستانی فکر کے مقابلے میں جو فلسفیانہ اور صوفیانہ تجربہ میں غرق تھیں۔

اور جب عقل کی فطری آزادی کو مختلف بندشیں لگ جاتی ہیں تو عقل اپنی حقیقت پسندی کھو کر حقائق سے دور ہو کر پرواز کرتی ہے اور حقائق سے دور غیر متعلق فکری مواد سے رایوں اور احکام کی تشکیل کرتی ہے۔ اور اس طرح غور وفکر اور اظہار ومباحثہ میں آزادی سے محرومی اسے حقیقت پسندی سے تجریدی آئیڈیل ازم کی طرف پھیر دیتی ہے۔

جب عقل پر خواہشات کا غلبہ ہو جاتا ہے اور وہ تلاش حق میں اس کی فکری آزادی کو مقید کر دیتی ہیں تب وہ حقیقت کے موجودہ مناظر سے صرف نظر کر کے ذات کی دنیا میں ڈوب جاتی ہے تا کہ خواہشات کی مرضی کے مطابق ان کے لئے وجہ جواز پیدا کرے۔ اور ان حقائق سے چشم پوشی کرتی ہے جو اس کے برعکس دوسری جہت کو درست ٹھراتے ہیں۔ ہم سر کی آنکھوں سے بہت سے لوگوں کو دیکھتے ہیں کہ ان کی خواہشات انہیں تباہی کی طرف لے جارہی ہوتی ہیں اور ان کی خواہشات کے تسلط میں چونکہ ان کی عقلیں قید ہوتی ہیں اور انہیں وہ قریبی حقائق دیکھنے سے روک دیا جاتا ہے جو تباہی کے انجام کی خبر دے رہے ہوتے ہیں، عقلوں میں ایسی حرکت نہیں پیدا ہوتی جو بچاؤ کی وہ تدبیریں بتائے جن کی خبر ارد گرد کے حقائق خود چیخ چیخ کر دیتے ہیں۔

قرآن کریم نے اس کیفیت کے متعدد مناظر پیش کئے ہیں اسی میں سے سورہ واقعہ میں اصحاب الشمال کا بعث بعد الموت کو جھٹلانا بھی ہے جو اس وجہ سے تھا کہ وہ عیش پرستی میں ڈوبے ہوئے تھے جس میں ان کی خواہشات پاوں پسارے ہوئی تھیں۔ انہوں نے ان کی عقلوں پر پردہ ڈال دیا تھا تا کہ وہ کائنات کے ان حقیقی مناظر کو نہ دیکھیں جو آخرت میں اٹھائے جانے پر دلالت

کرر ہے ہیں مزید ان کو دھوکہ دے کر یہ فیصلہ بھی کرایا کہ زندگی بس یہی زندگی ہے جس میں عیش وعشرت حاصل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: {إِنَّهُم كَانُوا قَبْلَ ذَٰلِكَ مُتْرَفِين. وَكَانُوا يُصِرُّونَ عَلَى الحِنْثِ العَظِيم .وكانُوا يقُولُون أَئِذَا مِتْنَا وكنّا تُرَاباًوَّعِظَا ماً أَئِنَّا لَمَبْعُوثُون .أَوَ آبَا ؤُ نَا الأَوَّلُونَ﴾(سورة الواقعة :۴۵-۴۸) (یہ وہ لوگ ہیں جو اس انجام کو پہونچنے سے پہلے خوش حال تھے۔ کہتے تھے'' کیا جب ہم مرکر خاک ہوجائیں گے اور ہڈیوں کا پنجر رہ جائیں گے تو پھر اٹھا کھڑے کیے جائیں گے؟ اور کیا ہمارے باپ دادا بھی اٹھائے جائیں گے جو پہلے گزر چکے ہیں؟)۔

پھر قرآن کریم کوشش کرتا ہے کہ خواہشات میں خوابیدہ ان عقلوں کو آزاد کرے اور ان کی اصل آزادفطرت کی طرف واپسی کا انہیں عادی بنائے تا کہ وہ حقیقت کے مشاہدات سے اپنے سفر کا آغاز کرکے آخرت کی اس حقیقت تک پہونچنے کا رخ کریں جس کے بارے میں خواہشات کے غلبہ کے باعث وہ خطا کرگئی تھیں۔ اللہ تعالیٰ عقل کو یہ کہہ کر چونکا دیتا ہے : {أفرأَيْتُم مَّا تُمْنُون. أَأَنْتُم تخلُقُونَه أَمْ نَحْنُ الخَالِقُون.... .أفرأَيتُم مَا تَحْرُثُون .أَأَنْتُم تَزْرَعُونَه أَمْ نَحْنُ الزَّارِعُون ....أفَرَأَيْتُم المَاءَ الذِى تَشْرَبون .أَأَنتُم أَنْزَلْتُمُوه مِنَ المُزْنِ أم نَحْنُ المُنزِلُون }(سورة الواقعة :۵۸-۵۹-۶۳-۶۴-۶۸-۶۹)

(کبھی تم نے غور کیا، یہ نطفہ جوتم ڈالتے ہو،اس سے بچہ تم بناتے ہو یا اس کے بنانے والے ہم ہیں؟.....کبھی تم نے سوچا، یہ بیج جوتم بوتے ہو،ان سے کھیتیاں تم اگاتے ہو یا ان کے اگانے والے ہم ہیں؟ ......کبھی تم نے آنکھیں کھول کر دیکھا، یہ پانی جوتم پیتے ہو،اسے تم نے بادل سے برسایا ہے یا اس کے برسانے والے ہم ہیں؟)۔

امام محمد عبدہ نے ایسے لوگوں کی بہت خوب تصویر کھینچی ہے جن کی عقلوں پر خواہشات نے غالب ہوکر حقائق کی نشانیوں سے انہیں پھیر دیا۔ وہ کہتے ہیں: جب نبوت و مذہب کی کوئی بات ان

کے سامنے لائی جاتی ہے اوران کے اندر سے اسے سننے کا کوئی جذبہ کروٹ لیتا ہے تو انہیں جوفکر ونظر کی آزادی ملی ہوئی ہے اس سے وہ اس جذبے کو دبا دیتے ہیں اور منھ پھیر لیتے ہیں۔ اپنے کانوں میں انگلیاں ڈال لیتے ہیں کہ کہیں دلیل ان کے دماغ میں داخل نہ ہو جائے کہ پھر عقیدہ کا پابند ہونا پڑے اوراس کے بعد پھر شریعت کا پابند بھی ہونا پڑ جائے۔ اوراس طرح وہ اس کی لذت سے محروم کردئے جائیں جو انہیں حاصل ہے اور جسے وہ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ یہ دلوں کا مرض ہے۔ (رسالۃ التوحید ص ۱۰۴)

اور جب عقل پر آبائی رسوم ورواج کی تقلید کا غلبہ ہو جائے اور آزادی فکر کو اس کا پابند کردیا جائے تو وہ موجودہ زندگی کی مشکلات ومسائل سے صرف نظر کر کے گذرے ہوئے آباء واجداد اوران کے گئے زمانے سے غور وفکر کے لئے مواد منتخب کر کے اس سے پیمانے اور احکام تشکیل دے گی اور جنھیں وہ موجودہ صورتحال کے مسائل پر لاگو کردے گی اس میں ایک طرح کی تاریخی مثالیت پسندی ہوگی۔ وہ تاریخ کے واقعات کو غور وفکر کے لئے نہیں دیکھے گی بلکہ آبائی ورثے کی آنکھ بند کر کے تقلید کرے گی۔

جاری وساری زندگی کے دلائل پر حقیقت پسندانہ نگاہ ڈالنے کے بجائے عقل کو معطل کر کے اس کی آزادی چھین لینے کے اس عمل پر قرآن کریم شدید نکیر کرتا ہے۔ وہ ابراہیمؑ کی قوم کے بارے میں یوں تذکرہ کرتا ہے: {وَأتْلُ عَلَيهِم نَبَأ ابراهيمَ۔إذْقَالَ لأبيهِ وقَوْمِه مَا تَعبُدُون ۔قالوا نَعْبُدُ أصْنَاماً فَنَظَلُّ لَها عَاكِفين ۔قالَ هَل يَسْمَعُونَكُم إذْ تَدْعُون۔أو يَنْفَعُونَكم أو يَضرُّونَ۔ قَالُوا بَلْ وَجَدْنَا آباءَ نَا كَذَلِکَ يَفْعَلُونَ}(سورة الشعراء: ۶۹ –۷۴) (اورانہیں ابراہیمؑ کا قصہ سناؤ جب کہ اس نے اپنے باپ اوراپنی قوم سے پوچھا تھا کہ ''یہ کیا چیزیں ہیں جن کو تم پوجتے ہو؟''۔ انھوں نے جواب دیا'' کچھ بت ہیں جن کی ہم پوجا کرتے ہیں اور انہیں کی سیوا میں ہم لگے رہتے ہیں''۔ اس نے پوچھا'' کیا یہ تمھاری سنتے ہیں

جب تم انھیں پکارتے ہو؟ یہ تمھیں کچھ نفع یا نقصان پہنچاتے ہیں؟ انھوں نے جواب دیا ''نہیں ، بلکہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایسا ہی کرتے پایا ہے)۔

ان لوگوں کو تقلید آباء کی بیڑیوں نے صورتحال کے مشاہدے سے روک دیا جبکہ ابراہیم کوشش کررہے تھے کہ انہیں اسی طرف لوٹائیں تا کہ عقل تقلید کے تسلط سے آزاد ہو اور تلاش حق میں حقیقت پسند بنے۔ یہی صورتحال فرعون اور اس کے درباریوں کی تھی۔ موسیٰؑ حقیقی نشانیاں اور قطعی شواہد توحید کی دعوت صحیح ثابت کرنے کے لئے لائے تھے وہ اس دعوت سے منھ پھیرتے تھے۔{قَالُوا أَجِئْتَنَا لِتَلْفِتَنَا عَمَّا وَجَدْنَا عَلَيه آبَاءَنَا وَتَكُونَ لَكُمَا الْكِبْرِيَاءُ فِي الْأَرْضِ وَمَا نَحْنُ لَكُمَا بِمُؤْمِنِيْنَ}(سورة یونس :۷۸) (انہوں نے جواب میں کہا کیا تو اسی لئے آیا ہے کہ ہمیں اس طریقے سے پھیر دے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے اور زمین میں بڑائی تم دونوں کی قائم ہو جائے؟ تمہاری بات تو ہم ماننے والے نہیں ہیں)۔ تقلید کے حجاب نے انہیں آباء پرستی کی دنیا سے مانوس کر دیا تھا اب وہ حقیقت کی دنیا میں اس کا کوئی متبادل نہیں چاہتے تھے۔

اگر عقل پر کہانت یا صوفی ولایت جیسی روحانی نگرانی مسلط کر دی جائے تب وہ کائنات کی نشانیوں اور لوگوں کی زندگی کے حقائق سے آنکھ بند کر کے روحانی مراقبوں اور خیالی توہمات میں بند ہو جائے گی وہ پھر مجرد غور و فکر میں لطف تلاش کرے گی کیونکہ اسے یہ باور کرایا گیا ہے کہ حقیقت کو مجرد عالم قدوسیت میں تلاش کیا جاتا ہے۔ حقائق کی دنیا سے کچھ ہاتھ آنے والا نہیں ہے۔ اس لئے عالم اسلام پر قابض ہونے کے بعد مغربی استعمار نے تصوف کی تحریکوں کی حوصلہ افزائی کی۔ ان کے لئے حالات سازگار کئے کہ ان کی روحانی رہنمائی سے لوگ رجوع کریں اور اس طرح لوگوں کی نظروں سے وہ سامراجی منصوبے اوجھل رہیں جو وہ اسلامی زندگی کی موجودہ صورتحال کے لئے تیار کر رہے ہیں ۔

اگر رائے پر اظہار و استدلال کی پابندی لگا دی جائے اور فکری یا سیاسی ہتھوڑے سے

عقل کی آزادی کو کچل دیا جائے تو وہ حقیقی صورتحال کو موضوع فکر بنانے سے اعراض کرنے لگے گی۔ کیونکہ اگر زندگی کی اصلاح کے لئے رائے کا اعلان نہ کیا جا سکے تو پھر اس کا فائدہ کیا ہے؟ اور پھر وہ اپنی ذات میں سمٹ جائے گی تا کہ مجرد قدروں اور مثالی اصولوں میں گردش کرے جن پر سیاسی جابروں اور فکری جلادوں کی طرف سے عموماً شدید پابندی نہیں ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے جب جب آزادی اظہار کو سلب کرنے میں شدت آتی ہے، افراد اور جماعتوں کی صورت میں مجرد مثالیت پرستی کا ذہن رکھنے والوں کی کثرت ہو جاتی ہے۔ عقل کو جب اپنے ماحول کی اصلاح کے لئے غور وفکر سے روک دیا جاتا ہے تو وہ اپنے لئے ایک خیالی آماجگاہ بناتی ہے پھر وہ اپنی فکری تگ ودو کو اسی تک محدود کر لیتی ہے۔ ہوسکتا ہے بعض اشراقی رجحان والے شیعہ گروپ سیاسی ظلم کے ادوار میں اسی وجہ سے وجود میں آئے ہوں جس طرح کہ جدید عرب دنیا میں فکری اور سیاسی جبر وتشدد کے نتیجہ میں بعض اسلامی جماعتیں مثالیت پرستی کے مسلک پر وجود میں آئیں۔

اسلامی ذہن عام طور سے حقیقت پسندانہ ذہن تھا۔ مگر ہم گاہے گاہے اس صفت میں خلل محسوس کرتے ہیں جو تجرید کی طرف مائل ہونے کی صورت میں ہوتا ہے۔

اور اگر ہم گہرائی سے دیکھیں تو پائیں گے کہ اس کا بیشتر سبب آزادی رائے کے میدان کا تنگ ہو جانا ہے۔ اس کی سب سے نمایاں دلیل شاید یہ ہو کہ جب اجتہاد کے سلسلے میں فقہاء کی عقلوں سے آزادی رائے کو سلب کر لیا گیا تو کس طرح وہ مسلمانوں کی حقیقی مشکلات کا سامنا کر کے انہیں شرعی رخ دینے سے احتراز کر کے مجرد افتراضی فقہ میں مقید ہو گئیں۔ اور کس طرح اسلامی ملکوں میں خاص طور سے بعد کے ادوار میں اسلامی ذہن پر سیاسی استبداد کی وجہ سے مثالی رجحان اس حقیقت پسندانہ سیاسی فکر پر غالب آ گیا جس سے توقع کی جاتی کہ حکومت کے اداروں اور زمانے کے تغیر کے ساتھ اس کی موزوں شکلوں کے سلسلے میں حقیقت پر مبنی رائے پیش کرے گی۔ چنانچہ فقہ المعاملات کے برخلاف اسلام کا سیاسی فقہ فکری اور تہذیبی ارتقاء کے دور میں بھی حقیقت

سے زیادہ مثالیت سے قریب تر ہو کر آیا۔

غرض یہ کہا جا سکتا ہے کہ آزادی رائے اپنی مختلف سطح پر فکر و نگاہ کو حقیقت پسندی عطا کرتی ہے اور آزادی کو کچلنے سے تجریدی مثالی فکر کی طرف رجحان بڑھتا ہے۔

۶-آزادی رائے اور تنقید

آزادی رائے کا معرفت کی تگ و دو میں عقل کو موازنے اور تنقید کا فریم دینے میں اہم رول ہے۔ جب وہ نگرانی اور نگاہ بندی سے آزاد ہو جاتی ہے تو زیر نظر موضوع کے مختلف مالہ و ماعلیہ سے واقف ہونے کا اسے موقعہ ہاتھ آتا ہے۔اس وقت اسے مختلف معلومات میں تقابل اور ان میں جو متضاد ہیں ان میں موازنے کا موقعہ ملتا ہے ساتھ ہی اسے ضعف کے مظاہر اور قوت کے مظاہر سے آگاہ ہونے کا اور تقابل کے دوران جانچتے ہوئے یہ بھی جاننے کا موقعہ ملتا ہے کہ جو فکری مواد اس کے سامنے ہے۔اس میں صحیح کیا ہے اور غلط کیا ہے۔اس سب کے نتیجہ میں وہ صحیح نقطہ نظر اور صحیح فیصلے تک پہونچتا ہے۔ابراہیم خلیلؑ کے ساتھ یہی ہوا انہوں نے ہر نگرانی سے آزاد عقل کو اللہ کی معرفت کے لئے مختلف طرح کی چیزوں کی طرف متوجہ کیا اور نگاہ کو اپنی قوم کے معبود پتھروں اور سورج چاند تاروں کے بیچ اور اپنے ان خیالات کے بیچ جو ان سب سے بڑے ایک اور وجود کے سلسلے میں دل میں آتے تھے سرگرداں کیا اور موازنے اور جانچ سے اول الذکر چیزوں کے ضعف کے پہلو اور آخری مفروضے کی قوت کے پہلو ان کے سامنے آشکارا ہو گئے اور اسی تنقیدی ذہن کے ذریعہ وہ صحیح رائے تک پہونچ گئے اور کہہ اٹھے :{إِنِّي وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِي فَطَرَ السَّمَاوَاتِ وَالأَرْضِ حَنِيْفاً وَمَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴾(سورة الانعام : ۷۹) (میں نے تو یکسو ہو کر اپنا رخ اس ہستی کی طرف کر لیا جس نے زمین اور آسمانوں کو پیدا کیا ہے اور میں ہرگز شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں)۔

اور جب عقل پر تقلید آباء کی نگرانی یا مختلف طرح کی قوت کے اداروں اور با اثر لوگوں

کی طرف سے نگاہ بندی کردی جاتی ہے تو وہ چیزوں کے صرف ایک پہلو اور ایک رنگ کو دیکھتی ہے۔ موازنے کے محرکات اس میں بیدار نہیں ہوتے لہذا وہ زیر نظر معلومات کے ضعف اور قوت کے پہلو سے بھی نا آشنا رہتی ہے اور پھر وہ لکیر کی فقیر بن جاتی ہے اور بہت دفعہ غلط فیصلوں تک پہونچتی ہے۔ یہی صورتحال فرعون کی قوم اور اس کے درباریوں کی تھی کہ جب اس نے ان کی عقلوں کو پابند کردیا کہ وہی کچھ دیکھیں جو وہ خود ان کے سامنے پیش کرے جبکہ مرد مومن نے ان کے سامنے دوسری چیزیں بھی موسیٰ کو قتل کرنے کی فرعون کی رائے سے متعلق رکھیں۔ فرعون نے اپنی رائے سے مطمئن کرنے کے لئے لوگوں کو جمع کیا تھا چنانچہ وہ اس پابندی کو مستحکم کرنے اور اس پر زور دینے کے لئے کہتا ہے:

{ قَالَ فِرْعَونُ مَا أُرِيكُم اِلَّا مَا أَرى ومَا أَهْدِيكُم اِلاَّ سَبِيلَ الرَّشَاد }(سورة غافر : ۲۹) (فرعون نے کہا، میں تو تم لوگوں کو وہی رائے دے رہا ہوں جو مجھے مناسب نظر آتی ہے اور میں اسی راستے کی طرف تمہاری رہنمائی کرتا ہوں جو ٹھیک ہے)۔ قوم نے بھی اسی ایک راہ کی پیروی کی جو فرعون نے انہیں دکھائی تھی اور اس قیمتی سامان فکر سے منھ موڑ لیا جو مرد مومن نے ان کے سامنے رکھا تھا۔ غرض ان کا انجام گمراہی ہی ہونا تھا۔

جب اعلان واستدلال کی سطح پر آزادی رائے حاصل ہوتی ہے تو عقل مخالف رائے بھی سنتی ہے اور مخالف کے سامان فکر سے بھی آگاہ ہوتی ہے۔ اور گفتگو کے درمیان رایوں میں تقابل بھی ہوتا ہے جس میں کمزور گر جاتا ہے اور طاقتور برقرار رہتا ہے۔ اس امر کا مشاہدہ بخوبی کیا جاسکتا ہے، لیکن اظہار و گفتگو پر پابندی سے اس کے سوا کوئی نتیجہ نہیں نکلتا کہ ایک رائے پر عقل نظر بند ہوجائے۔ اسی کے لئے اس کا تعصب رہ جائے۔ عقل چیزوں کو صرف ایک زاویے سے دیکھے جو بہت دفعہ خلاف حقیقت بھی ہو۔ ایسی صورت میں رایوں کے لئے تعصب اور ان سے اندھی عقیدت ہر اس ماحول میں بڑھے گی جس میں آزادی اظہار چھین لی گئی ہو۔ جبکہ ہر اس ماحول میں

جہاں یہ آزادی ہو وہاں ذہنی لچک اور اصلاحی مشوروں کے لئے کشادہ دلی میں اضافہ ہوگا۔ اس سلسلے میں نبوی تربیت کتنی پیاری تھی اس میں متضاد رایوں کے لئے کشادہ دلی کا راستہ اظہار استدلال اور تنقید کی آزادی فراہم کر کے اختیار کیا گیا تھا۔ نبی ﷺ نے اپنے لئے اے لوگو مجھے ''مشورہ دو'' کا شعار منتخب کیا تھا۔ یہ ایک تربیتی شعار تھا جس کا مقصد مسلمانوں کو قول و دلیل کی وسیع آزادی فراہم کر کے تنقید و موازنے کے طرز پر ان کی تربیت کرنا مقصود تھی۔ ورنہ حق تو آپ کے سامنے واضح تھا کیونکہ آپ کو غلطیوں سے محفوظ وحی کی تائید حاصل تھی۔

آزادی رائے جو مسلمانوں کے درمیان خاص طور سے اولین ادوار میں عام تھی وہ اسلامی ذہن کی تنقیدی تربیت کا سبب بنی۔ اسے فقہی، مذہبی اور فلسفہ کے تراث میں صاف دیکھا جاسکتا ہے۔ جب کہ نقطہ نظر اور فیصلے آزادی کے ماحول میں وسیع موازنوں کے بعد وجود پذیر ہوتے تھے۔ یہ تو زوال کے دور میں مسلکی تعصب تک معاملہ جا پہونچا جس میں مقابل رائے کو ٹھکرانے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا یہ اس وقت ہوا جب اجتہاد کی آزادی تنگ اور بسا اوقات منجمد کر دی گئی۔ اور حکومت نے فکر کو مسلکی رخ دے دیا جس میں ایک طرح سے بقیہ مسالک پر پابندی اور ایک مسلک تک محصور رہنا شامل تھا۔ اس طرح عقل ان مختلف خیالات سے وسیع پیمانے پر واقف ہونے کے مواقع سے محروم ہوگئی۔ جو متعدد فقہی اور کلامی مذاہب کی صورت میں موجود تھے۔

۷- آزادی رائے اور معروضیت

جب تلاش کے دوران عقل پر خواہشات کے مختلف عوامل کا پردہ پڑ جاتا ہے تو یہ عوامل اسے اسی رخ کا پابند کر دیتے ہیں جو شخصی خواہشات کو مرغوب ہوتا ہے۔ اور انہیں خواہشات کے مطابق اس سے فیصلہ کراتے ہیں۔ یہی معاملہ تقلید کے ساتھ بھی ہے وہ بھی آبائی ترکے کے حدود میں گھری ہوئی نسبتاً زیادہ وسیع دائرہ ذات گھیر دیتی ہے اور دلائل کا اس طرح مشاہدہ نہیں کر دیتی

جس طرح خارج کا موضوع تقاضا کرتا ہے۔

اور جب عقل پر خارج سے نگاہ بند نگرانی ہوتی ہے تو اس نگرانی کا ہدف بھی یہ ہوتا ہے کہ عقل کو اس طرح ہانک لے جائے جس سے اس کے اغراض کی تکمیل اور خواہشات کی تکمیل ہوتی ہو۔ وہ ایسی ہر راہ کے آڑے آجاتی ہے جو دوسرے نتیجہ تک لے جاسکتی ہو۔ اس وقت نگاہ بند ذاتی خواہش سے آزاد ہو کر معلومات کے ساتھ عقل کے غیر جانبدارانہ رویہ کے راستے مسدود ہو جاتے ہیں اور اس کے سبب حقیقت گم ہو جاتی ہے۔

اس کے برعکس جب عقل ذاتی خواہشات اور دوسروں کی نگرانی سے آزاد ہو جاتی ہے تو اس کا براہ راست تعلق سامان فکر اور اس کے آزاد مالہ وماعلیہ سے ہو جاتا ہے۔ اس وقت اس پر آشکارا وہ حقیقت ہوتی ہے جو واقعی ہوتی ہے نہ کہ وہ جو ذاتی محرکات چاہتے ہیں۔ نبی ﷺ کی مسلمانوں کی اس تربیت کا شاید ایک تقاضا یہ بھی تھا آپ نے فرمایا تھا: ''پیچھے چلنے والے نہ بن جاؤ کہ یہ کہو کہ لوگ احسان کریں گے تو ہم بھی احسان کریں گے اور لوگ ظلم کریں گے تو ہم بھی ظلم کریں گے بلکہ اپنے نفس کو قابو میں رکھو۔ اگر لوگ احسان کریں تو احسان کرو اور اگر ظلم کریں تو ظلم نہ کرو'' (ترمذی)۔ یہ نگاہ بندی کے ان عوامل سے آزاد ہونے کی دعوت ہے جو لوگوں کی تقلید پیدا کرتی ہے تاکہ عقل کو ظلم کا غیر جانبدارانہ مطالعہ کر کے ظالم کی قباحت کا ادراک کرنے کی توفیق ملے۔ نہ کہ عقل اسے اس بنیاد پر جائز قرار دے کہ دوسروں کی جانب سے ان کے ذاتی مقاصد کے لئے اس کا ارتکاب ہوا ہے۔

اظہار اور مناظرے کی سطح پر آزادی رائے کا بھی یہی معاملہ ہے۔ رائے کا اعلان اور اس کی تبلیغ کی صورت میں گفتگو کے نتائج یہ انکشاف کریں گے کہ اس رائے میں ذاتی عناصر کا کتنا حصہ ہے۔ یہ وہ عناصر ہیں جو انسانی مزاج سے چپکے ہونے کی وجہ سے عقل سے مخفی رہ جاتے ہیں۔ یا قصدا کچھ مقاصد کی تکمیل کے لئے ان کا جنم ہوتا ہے۔ غرض گفتگو ان سب کو بے پردہ کر دے گی۔ اور

نگاہوں کو معروضی صورتحال کے حقیقی مالہ وماعلیہ کے ساتھ دوبارہ موضوع پر غور وفکر کے لئے مجبور کرے گی۔

ہم پر خود بہت دفعہ انکشاف ہوتا ہے کہ کسی معاملے میں کچھ فیصلے ہم صادر کرتے ہیں جو حقیقت میں اس کی ذات کا حصہ نہیں ہوتے ہیں مگر ہم انہیں زبردستی اس پر تھوپتے ہیں مگر یہ اس وقت صاف ہوتا ہے جب وہ فیصلے گفتگو کے میدان میں پیش ہوتے ہیں۔

جب اظہار رائے کی آزادی کو کچل دیا جاتا ہے تو عقل اپنی ذات کی طرف پلٹ جاتی ہے تاکہ ان تقاضوں کی غیر موجودگی میں جنہیں احکام کی کسوٹی ہونا چاہئے وہ اپنے ذاتی پیمانوں کو فعال کرے کیونکہ وہ رائیں جن تک اس کی رسائی ہوگی وہ انسان کی ذات تک محدود رہیں گی اور خارجی تنقید کے لئے انہیں پیش نہیں کیا جاسکے گا جو موضوع کے مالہ وماعلیہ پر انھیں پرکھے رسول ﷺ تو اپنے سارے ساتھیوں کے لئے آزادی کا میدان کشادہ رکھتے تھے تاکہ ہر ایک اپنی تجویز پیش کرے، اس کو معروضیت کے میزان پر رکھا جائے اور ذاتی رجحان کی ملاوٹوں سے اسے پاک کیا جائے اور یہ ایک فکری تربیت ہو جو فکر میں معروضیت کا عادی بنائے۔ اس کی نمایاں مثال غزوہ حنین کے فوراً بعد کا واقعہ ہے، جب نبی ﷺ نے انصار کو چھوڑ کر ان لوگوں کو مال غنیمت دیا جن کے ایمان لانے کی امید تھی، اس پر ان کے ذہن ذاتی تجزیے کے ساتھ سوئے ظن کا شکار ہونے لگے۔ نبی ﷺ نے معاملہ میں اظہار رائے کا بھرپور موقعہ دیا اور خود اپنا نقطہ نظر ان کے سامنے رکھا جو حقیقی مالہ وماعلیہ کی روشنی میں بنایا تھا۔ تب لوگوں نے ان کے معروضی نقطہ نظر سے اتفاق کرلیا۔ اور اگر ان کی رایوں کو دبا دیا گیا ہوتا تو صورتحال کچھ اور ہی بن جاتی۔

۸- آزادی رائے کا عمومی کردار فکر کی وحدت میں

ہم نے پیچھے بیان کیا کہ فکر کی وحدت میں اول محرک آئیڈیالوجی اور خاص طور سے مذہبی آئیڈیالوجی پر اطمینان ہے۔ ہم اس پر اضافہ کرسکتے ہیں کہ یہ پہلا محرک دراصل فکری

وحدت کا بانی محرک ہے جو عقل کی مشترک منہجی اوصاف پر تشکیل کرتا ہے تاہم یہ اوصاف عملا ظہور پذیر ہونے کے بجائے ظہور پذیری کی استعداد سے قریب تر ہوتے ہیں، یہ بالفعل واقع ہو جانے کے مقابلے میں وقوع پذیری کے امکان سے قریب تر ہوتے ہیں۔

یہ منہجی اوصاف بالفعل ظہور پذیر ہو کر فکر کے فعال اوصاف اس وقت بنتے ہیں جب فعالیت دینے والے عوامل موجود ہوں ان میں سب سے اہم عامل آزادی رائے ہے۔ اگر عقلیں عقیدہ کے حقائق سے متاثر ہو کر اور ان پر یقین کر کے آزادی رائے جیسے محرک سے اثر پذیر ہوئے بغیر رہیں تو یہ منہجی اوصاف بھی بالقوۃ موجود رہ کر غور و فکر کے اس عمل میں عملا موجود نہیں رہیں گے جو فکری وحدت کے خواب کو پورا کرے۔

مسلمانوں کو جس آزادی رائے کا وافر حصہ ملا تھا وہ عقیدہ کی منہجی تاثیر کو استعداد کے دائرے سے نکال کر فعالیت کے دائرے میں لانے کا محرک تھی۔ اسی لئے اس نے مشترک منہجی اوصاف کو حقیقت کا روپ دیا۔ اور جب یہ اوصاف عام سطح پر اسلامی ذہن کا مشترکہ رویہ بن گئے تو انہوں نے مسلمانوں کی فکری وحدت میں اہم کردار ادا کیا۔

یہ کہا جا سکتا ہے کہ آزادی رائے نے مسلمانوں میں مشترکہ منہجی اوصاف پیدا کئے۔ اور ان منہجی اوصاف نے ان کو فکری وحدت عطا کی۔ اور اس فکری وحدت سے پوری اسلامی زندگی کو نظریاتی صورت میں بھی ڈھال دیا گیا جو مختلف علوم میں نظر آتی ہے اور عملی صورت میں بھی جو مختلف تہذیبی شکلوں میں دکھائی دیتی ہے۔ اس طرح وہ اس شیرازے کی طرح ہو گئی جس نے اسلامی لباس باہم مربوط اور اس کی صورتوں کو ہم آہنگ کر دیا ہو۔ ہم اس کا یقین حاصل کرنے کے لئے تصور کر سکتے ہیں کہ اسلامی زندگی اس وقت کیسی ہوتی اگر مسلمانوں کی ذہنیت ان اوصاف کے برعکس اوصاف یعنی جزئیت، پراگندگی، تجرید، لکیر پرستی اور خود پسندی سے متصف ہوتی۔ اس وقت فکری وحدت کے بکھر جانے کی وجہ سے اس زندگی کا پورا شیرازہ بکھر گیا ہوتا۔

مسلمانوں کی فکری وحدت میں آزادی رائے کا کتنا اثر تھا اس کا تعین ہم ان کی زندگی کے ان مختلف ادوار میں موازنے سے بھی کر سکتے ہیں جن میں عملی تطبیق کی سطح پر آزادی رائے میں تفاوت تھا۔ بلکہ ان مختلف میدانوں میں موازنے سے بھی جن کو ایک ہی زمانے میں آزادی رائے سے حصہ تفاوت کے ساتھ ملا تھا۔

تو جب ہم پہلی سطح پر شروع کی چار صدیوں اور ان کے بعد کی اور خاص طور سے آخری صدیوں میں موازنہ کرتے ہیں تو ہم اس فیصلہ پر پہونچتے ہیں کہ پہلے دور میں مسلمانوں میں آزادی رائے زیادہ عام تھی خواہ فکری اجتہاد کی سطح پر ہو یا کسی حد تک سیاسی کشمکش کی سطح پر ہو۔ فقہ عقیدہ فلسفہ اور دوسرے علوم میں ہونے والے وسیع مناظرے اور اسی طرح بعض مثبت سیاسی مخالفتیں بھی جن کا تذکرہ تاریخ میں وقتاً فوقتاً ملتا ہے اس پر گواہ ہیں۔ اس کے نتیجہ میں اسی دور میں مسلمانوں میں زیادہ وحدت اور مضبوط شیرازہ بندی تھی کیونکہ وہ فکری وحدت میں پرودئے گئے تھے۔ فقہ اور اعتقاد میں نقطہ ہائے نظر کی کثرت بھی اس فکری وحدت کے دائرے ہی میں ایک قسم کا تنوع ہے جسے ہم نے غزالی کے یہاں دیکھا کہ مذہبی اور تہذیبی چیلنجز کا سامنا کرنے کے لئے سب کو اسلام کے دفاع کے لئے آگے بڑھاتی ہے۔ بلاد اسلامیہ سے دور جو ممالک تھے ان کی حیثیت بھی ایک بڑی سلطنت کی ریاستوں کی تھی جو سب کو جہاد کی وحدت میں شامل کر کے ممالک فتح کرنے اور دعوت عام کرنے اندلس سے ماوراءالنھر تک لے جاتی تھی۔ دوسرے دور میں فقہ اور عقیدہ میں مسلکی تعصب بڑھا اور اس حد تک پہونچا کہ مسلمانوں کو منتشر کر ڈالے۔ اس میں پڑ کر وہ دین کو درپیش نئے چیلنجز کے مقابلے اور نئی صورتحال پر دین کو منطبق کر کے دین کی مدد کرنے سے غافل ہو گئے۔

جب ہم دوسری سطح پر موازنہ کرتے ہیں، فقہی اور اعتقادی میدان کو ایک طرف اور سیاسی میدان کو ایک طرف رکھ کر کے تو واضح ہوتا ہے کہ پہلے میدان کو آزادی رائے میں سے

دوسرے کے مقابلے میں بہت زیادہ حصہ ملا تھا۔ اسی سے پھر اس کی بھی توجیہ ہو جاتی ہے کہ کیونکر مسلمان فقہ واعتقاد کی بڑی بنیادوں پر متحد ہو سکے؟ کیونکہ اس سلسلے میں آزاد عقل نے ان کے اندر ان مشترک بنیادوں کو پختہ واستوار کیا جو حقیقت حال کی رہنمائی کرتی ہیں۔ یہ اتحاد سیاسی بنیادوں پر اتحاد سے بہت زیادہ تھا کیونکہ اسلامی دماغ سیاست میں آزادی اور وسیع مشاورت کے ساتھ بحث ونظر سے ڈرتا تھا۔ چنانچہ اس نے سیاسی فقہ میں ایسے عملی قواعد جنم نہیں دئے جو سیاسی اداروں کو مسلمانوں کے لئے وحدت ساز عملی نمونوں کی شکل میں منظّم کرتے۔ بلکہ وہ مجرد اصولوں میں سرگرداں رہا جیسا کہ ہم سیاست شرعیہ کی کتابوں میں دیکھتے ہیں۔ اسی نے سیاسی استبداد کے پھیلنے میں مدد کی جس نے امت کے افتراق میں اپنا رول خاص طور سے آخری ادوار میں خوب ادا کیا۔ گویا آزادی رائے مسلمانوں میں جب موجود ہوئی اس نے وحدت کا پھل دیا اور جب وہ غائب یا کمزور ہوگئی تو افتراق وانتشار کے کڑوے پھل مسلمانوں کے حصے میں آئے۔

فصل سوم:

آزادی رائے اور فکری وحدت
موجودہ اسلامی صورتحال میں

فکر اسلامی کی وحدت اور اس میں آزادی رائے کے اثر سے متعلق ہمارا گذشتہ تجزیہ ایک پہلو سے نظریاتی اور دوسرے پہلو سے تاریخی عموم لئے ہوئے تھا۔ مگر اب ہم کوشش کریں گے کہ موجودہ اسلامی صورت حال کے بارے میں اس پہلو سے سوچیں کہ فکری وحدت کی اس میں پوزیشن کیا ہے اور اس پوزیشن کا عام زندگی کی وحدت یا افتراق میں کیا رول ہے اور ان سب کا تعلق آزادی رائے سے ہونے اور نہیں ہونے کے پہلو سے کیا ہے؟۔ پھر ان سب کی روشنی میں ہم کوشش کریں گے کہ فکر میں وحدت پر مبنی ذہن سازی کیلئے بنیادیں عملی تجاویز کی صورت میں پیش کریں جو آزادی رائے پر مبنی ہوں اور اسلامی زندگی کے اہم مرحلوں میں وحدت کے مظاہر کا باعث بنتی ہوں۔

ا۔ آزادی رائے اور فکر اسلامی کی صورتحال

وحدت وانتشار کے پہلو سے مسلمانوں کی موجودہ صورتحال پر غور کرنے والا اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے کہ انتشار وافتراق زندگی کے تمام گوشوں کی گھیرابندی کئے ہوئے ہے۔ نہ صرف ظاہری پہلوؤں میں بلکہ ان فکری اصولوں کی گہرائیوں میں بھی جو زندگی کو رواں دواں رکھتے ہیں۔ شاید امت اسلامیہ کو اس کی گذشتہ تاریخ میں افتراق کی ایسی افتاد کا سامنا نہ ہوا تھا

جیسا کہ آج ہے۔ اور اس ہمہ گیر افتراق کا گہرا تعلق فکر کی منہجی صورتحال سے ہے۔ نیز اس کا گہرا تعلق آزادی رائے کو بڑے پیمانے پر سلب کر لینے سے بھی ہے۔ جس کی وضاحت آگے آئے گی۔

[أ] اسلامی صورتحال میں افتراق کے مظاہر

اسلامی صورتحال میں افتراق کے متعدد مظاہر ہیں۔ امت اسلامیہ کو عام ثقافتی افتراق نے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے۔ معرفت کے میدان میں اس کا مظاہرہ نظریاتی سطح پر بھی ہوتا ہے اور عملی رویے کی سطح پر بھی ہوتا ہے۔ اول الذکر سطح پر امت میں دو باہم بالکل مختلف ثقافتیں پائی جاتی ہیں۔ ایک ثقافت روایتی ماضی کی طرف کھینچتی ہے اور اس سے معرفت کا واحد مرجع اخذ کرتی ہے یا کرنا چاہتی ہے۔ یہ ماضی کی ایسی معرفت ہے جو مسلمانوں کے موجودہ مسائل سے بالکل کٹی ہوئی اور ان مسائل کے حل کے سلسلے میں مددگار کائناتی معرفت کے انسانی کسب سے بیزار ہوتی ہے۔ دوسری ثقافت مغربی ثقافت کے کسب کی طرف کھینچتی ہے اور اس سے معرفت کا واحد مرجع اخذ کرتی ہے یا کرنا چاہتی ہے۔ یہ وہ معرفت ہے جو امت کے دینی اور روایتی اصولوں سے بالکل کٹی ہوئی ہے اور زندگی کی تعمیر اور نمایاں تہذیبی کردار کی بازیافت، اسکے عزائم کے لئے بالکل اجنبی ہے۔

دوسری سطح پر دیکھیں تو اسلامی زندگی کے مظاہر اور ان کے طریقے دو ماڈلوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ ایک تقلیدی ماڈل ہے جو بچے ہوئے ورثے پر قائم ہے اور اسلامی قدروں پر تکیہ کرتا ہے مگر بہت دفعہ اس میں کم فہمی کا مظاہرہ بھی ہوتا ہے۔ دوسرا ماڈل مغربی تہذیب سے لایا گیا ہے جس کی بہت دفعہ بھدی نقل بھی اتاری گئی ہے۔

مسلکی اختلاف نے عقیدہ اور فقہ میں امت کو ٹکڑوں میں بانٹا ہوا ہے۔ ماضی سے اس نے وہ جھگڑے بھی ساتھ لے لئے ہیں جن کے لئے ہوسکتا ہے اس وقت واقعی جواز رہا ہو مگر گردش زمانہ نے جواز کی ان وجوہات کو مٹا دیا۔ اب موضوعی اختلافات نہیں بچے بلکہ ماضی

سے امت نے کچھ گناہ بٹور لئے جن کا کچھ سا بقین نے بد نیتی یا کم فہمی سے ارتکاب کیا ہوگا اور وہ نسلوں کا تعاقب کرتے آرہے ہیں۔ اور آج بھی افتراق کے عمل میں اپنی کارستانی انجام دے رہے ہیں۔ آپ کو اس کی وضاحت مل سکتی ہے سنی اور شیعہ، سنی اور اباضی اور سلفی اور اشعری فرقوں کے درمیان مسلکی افتراق سے۔ یہ افتراق زیادہ تر غیبی مسائل کے گرد گھومتا ہے جیسے اللہ تعالی کی رویت اس کی خبری صفات کی حقیقت اور ایسے ہی مسائل۔ صورتحال کبھی اتنی شدید ہو جاتی ہے کہ تکفیر اور لعنت اندازی تک نوبت پہونچ جاتی ہے شاید فقہی منافرت اعتقادی منافرت سے ہلکی ہو۔ لیکن اس کے باوجود تعصب اس پر اس قدر حاوی ہوتا ہے کہ اسکی بھی اجازت نہیں دیتا کہ تمام مسلکوں کو ایک مشترک بساط پر یکجا رکھ کر مسلمانوں کے عملی مسائل کے حل کے لئے ان سے یکساں طور سے استفادہ کیا جائے۔

سیاسی فرقہ بندی بھی واضح طور سے امت کو بانٹے ہوئے ہے۔ یہ صرف سیاسی دھڑوں کی کثرت میں ظاہر نہیں ہوتی جو زیادہ تر بناوٹی حالات میں مسلسل بڑھ رہے ہیں۔ بلکہ اسلامی دائرے میں اندرونی مسائل پر موقف میں باہمی ٹکراؤ سے بھی ظاہر ہوتی ہے۔ یہ اختلاف کبھی مسلمانوں کے درمیان مسلح تصادم تک پہنچ جاتا ہے۔ اور پھر ان عام مسائل میں بھی موقف کا اختلاف ہو جاتا ہے جو خود اسلام کے مستقبل سے متعلق ہوتے ہیں اور یہ ٹکراؤ بہت دفعہ اس حد تک ہوتا ہے کہ دشمن کے منصوبوں کو نافذ کرنے میں ان کی مدد کے لئے امت کے دشمنوں کی صف میں کھڑے ہونے تک نوبت پہونچ جاتی ہے۔ ہمارے سامنے افغانستان اریٹیریا اور جنوبی سوڈان کی مثالیں موجود ہیں۔

تحریک اسلامی کا سیلاب بھی جو نصرت اسلام کے لئے یقیناً مخلص ہے، افتراق کی بیماری سے محفوظ نہیں رہا۔ باجود اس کے کہ اسلامی تحریک کے کارکنان مسلمانوں کی صورتحال میں ہمہ گیر اسلام کو حقیقت کا روپ دینے اور ہمہ جہت اسلامی وحدت کے خواب کی تکمیل کے لئے

بڑے صدق واخلاص کے ساتھ سرگرم عمل ہیں۔مگر اس کے باوجود افتراق ان کے اندر تصورات کی سطح پر بھی اور طریقہ کار کی سطح پر بھی داخل ہوگیا ہے۔ان میں بہت سارے گروپ بن گئے ہیں جو ایک دوسرے سے پھوٹے ہوئے ہیں۔ان کے درمیان نوبت تکفیر اور لعنت اندازی تک بلکہ کبھی خونریز فتنوں تک پہونچ جاتی ہے۔گو کہ اللہ کے فضل سے ایسا کم ہوتا ہے۔اس افتراق کو زیادہ ہوا دینے اور بھڑکانے بلکہ کبھی کبھی دوبارہ زندہ کرنے میں زیادہ رول ان بڑے واقعات کا ہوتا ہے جو مسلمانوں کی صورتحال کو گاہے بگاہے ٹکڑوں میں بانٹ دیتے ہیں۔اس وقت دراڑیں بڑھتی نظر آتی ہیں اور چہرے گھومتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔آخری خلیجی واقعات میں اس کی عمدہ مثال موجود ہے۔

[ب] فکری انتشار کا رول مسلمانوں کے افتراق میں

مسلمانوں کے درمیان اس افتراق کا سبب کیا ہے حالانکہ اللہ کی کتاب ان کے درمیان ہے اور ان کو وحدت کی طرف دین کے ایک ضروری مقصد کی حیثیت سے بلا رہی ہے؟ ان کے افتراق کے اسباب کی تشخیص کے سلسلے میں بہت کچھ کہا جاسکتا ہے۔جیسے دین کے تقاضوں سے دوری ،بہت سے مسلمانوں میں ایمان کی کمزوری ،غالب تہذیب یعنی مغربی تہذیب کا اجنبی اثر ،معاشی پسماندگی جو امت کے تعلقات کی کڑیوں کو کمزور کردیتی ہے کہ انہیں آسانی سے توڑا جاسکے اس کے علاوہ کچھ اور اسباب۔لیکن جو اصل علت میں غور کرے گا جو افتراق کے ان تمام مختلف مظاہر کی جامع ہو وہ اسے واضح طور سے مسلمانوں کی فکری وحدت کے مضمحل ہوجانے میں پائے گا۔اس مفہوم میں جس کی ہم نے آغاز میں وضاحت کی اور جو پانچ منہجی اوصاف کی صورت میں ہے۔پھر وہ یہ بھی دیکھے گا کہ اس وحدت کے اضمحلال کا بھی ایک اصلی سبب ہے اور وہ عالم اسلامی میں آزادی رائے کا وسیع پیمانے پر سمٹ جانا اور وسیع پیمانے پر ہی آمریت کا عام ہوجانا ہے۔

آج مسلمانوں کے درمیان جو افتراق عام ہے جب ہم اس کو بے حجاب کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ بڑی حد تک فکر کے طریقے اور منہج میں اختلاف کے باعث وجود میں آیا ہے۔ یہ وہ اختلاف ہے جس نے ان مشترک منہجی اوصاف کو ختم کر دیا جو فکر ونظر کے طریقے کو ایک کر سکتے تھے جس کے بعد خیالات میں یکسانیت یا قربت ہوتی۔ اور مشترک ہدف کی طرف کوششیں بھی متحد ہو جاتیں۔ فکر کے منہاج میں بہت واضح خلل واقع ہو گیا یہ عام طریقے سے اسلامی ذہن پر اثر انداز ہوا اور اس کی ایسی تشکیل کی کہ فکر ونظر کے وقت نتائج بھانت بھانت کے ہو گئے اور عمل کے وقت کوششیں بکھر بکھر گئیں۔ چنانچہ وہ افتراق آج ہم دیکھ رہے ہیں۔ اس سے انکار نہیں کہ کچھ مسلمان فرداً فرداً اپنے فکری منہاج میں اولین ڈگر پر یعنی مشترک اوصاف پر متحد فکر اسلامی پر باقی ہیں مگر اجتماعی پیش قدمی کی باگ ہمیشہ عام ذہن کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔

موجودہ اسلامی فکر کے خلل کے مظاہر میں سے ایک وہ ہے جسے بحث ونظر میں جزئیت سے متصف کیا جاتا ہے۔ اسی خامی نے زیر غور مسائل پر سوچتے وقت سرمایہ فکر میں سے کچھ کو دور کر دینے اور کچھ متعین چیزوں پر ہی اکتفا کر لینے کی راہ پر امت کو ڈالا ہے۔

ساتھ ہی یہ حقیقت تک رسائی کے لئے معین معلومات کی بڑی مقدار کا استیعاب کرنے سے بھی کوتاہی کا باعث ہوتا ہے یہاں تک کہ سرمایہ فکر میں سے اختیار کردہ متعین نوعیت کے دائرے میں بھی۔ چہ جائیکہ وہ جسے غور وفکر کے میدان سے ہی ہٹا دیا ہے۔ مثال کے طور پر اسی خامی کے باعث روایتی اور مغرب زدہ لوگوں کے بیچ ثقافتی اختلاف ہوا۔ ایک گروہ نے امت کے مسائل کے حل کے لئے قدیم سرمائے پر اکتفا کیا اور علم ومعرفت کے میدان کی انسانی کاوشوں کی کمائی کو دور کر دیا۔ دوسرے گروہ نے اس کمائی کو ان مسائل کے حل کے سامان کے طور پر کافی سمجھا اور قدیم سرمائے سے بیزاری ظاہر کی، بلکہ ہر ایک نے جس قسم کا انتخاب کیا اس کے دائرے میں بھی ایک مخصوص نوعیت کے سامان فکر پر اکتفا کیا۔ اور اس سارے عمل میں ان پر جزوی ذہنیت حکمراں

رہی جس کا بھلا اس اسلامی ذہن سے کیا تعلق ہے جو دور اول میں سارے سرمایہ فکر کو اکٹھا کرتا تھا وہ سب بھی جو وحی کی صورت میں آیا اور وہ بھی جو پچھلوں کے علوم کی شکل میں انسان نے کمایا پھر وہ ان کو فکر و بحث کا مادہ بنا کر ایک بساط پر رکھتا تھا؟۔

خلل کا ایک مظہر پراگندہ طریقہ فکر کا غلبہ ہے۔ اس خامی نے امت کو مختلف مظاہر کے بیچ سے ان کے اسباب کی وحدت تک نفوذ کر جانے اور مختلف مفادات اور غایتوں سے گذر کر مشترک غایت کی وحدت تک نفوذ کر جانے سے روکا۔

غرض یہ فکر ہر چیز کو الگ اور غیر متعلق اکائی کی حیثیت سے اور مصالح اور غایتوں کو تنگ علاقائی حدود میں دیکھتی ہے۔ پھر اس انتشار پر اسلامی زندگی کے سفر کی بنا رکھتی ہے۔ مثال کے طور پر اسی سے وہ سیاسی افتراق پیدا ہوا جس کا ذکر گذشتہ سطور میں ہوا، یہ افتراق اس پریشان فکری کا ثمرہ تھا جو سیاسی واقعات میں سبب کی وحدت یعنی عالمی سامراجیت اور بڑی طاقتوں کی اجارہ داری کا ادراک نہیں کر سکی۔ اس طرح اس ادراک میں بھی کوتاہ رہی کہ اسلامی مستقبل کی وحدت کوششوں کو صحیح رخ دینے اور تیز رفتار تہذیبی کامیابی کے لئے سب سے بڑا سبب ہوگا اگر وہ ہر مسلم کی غایت بن جائے۔ مگر وہ تنگ علاقائیت اور مسلکی عصبیت میں راہ راست تلاش کرنے چلی گئی۔

خلل کا ایک مظہر فکر میں تجرید اور مثالیت کا رواج بھی ہے۔ آپ آج اسلامی فکر کے غالب رجحان کو دیکھیں گے کہ یا تو ماضی کے عشق میں گم اپنے قدیم ورثہ کی جگالی کر کے اس سے فیصلے اور حل کی تجاویز مرتب ہو رہی ہوں گی یا مستقبل میں گم ہو کر امت اسلامیہ کے مستقبل کے بارے میں خیالی محل تعمیر ہو رہے ہوں گے جس میں عدل و خیر کا غلبہ ہوگا اور جہاں ظلم اور شر ختم ہو گئے ہوں گے۔ اگر آپ اس سے آج کے کسی مسئلے کے بارے میں دریافت کریں تو وہ وہی سب کچھ بیان کرے گا۔ اور تجریدی مثالی فکر سے استشہاد کرے گا۔ اس فکر کا اس عہد اول کی

رہنما اسلامی فکر سے کیا تعلق ہے جب کہ زندگی کی حقیقی صورتحال سے فکر و بحث کا آغاز ہوتا تھا اس کے علل و امراض بتائے جاتے تھے اس کی بیماریوں کی تشخیص ہوتی تھی پھر اسی پر علاج کی بنا شریعت کے اصولوں کے مطابق رکھی جاتی تھی ۔ وہ علاج اسے بتدریج تہذیب و تعمیر کی بہتر حالت کی طرف لاتا تھا۔

مگر جب اسلامی فکر تجرید و مثالیت سے رنگ دی جائے تو تعجب نہیں ہونا چاہئے اگر وہ افتراق کا سبب بن جائے ۔ جیسے وہ فکر جو اسلامی تحریکات میں پھوٹ ڈال رہی ہے ۔ اس فکر کے حاملین کو جب حالات کے تھپیڑے جھنجھوڑتے ہیں تو حالات کے بارے میں ان کی علمی بے مائیگی انہیں مختلف قسم کے مثالیت اور تجرید کے رویوں تک لے جاتی ہے ۔ پھر وہ کئی گروہ بن جاتے ہیں اور ہر ایک دوسرے کو گناہ گار بتاتا ہے جیسا کہ خلیج کے بحران کے سلسلے میں سامنے آیا۔

فکر اسلامی میں خلل کے مظاہر میں تنقید و موازنے کے بجائے لکیر پرستی اور معروضیت کے بدلے ذاتی رجحان کے غلبہ کا بھی اضافہ کیا جاسکتا ہے ۔ اگر ہم مسلمانوں کے سوچنے کے غالب طریقے پر غور کریں تو ہم پائیں گے کہ یہ دونوں خامیاں ان پر غالب ہیں اور یہ دونوں ہی افتراق انتشار کے متعدد مظاہر کا باعث بنتی ہیں ۔

[ج] فکری انتشار میں استبداد کا رول

ہم نے پیچھے ذکر کیا کہ اسلام کے اعتقادی اصول ہی اسلامی فکر کی منہجی خصوصیات کی تشکیل کرتے ہیں ۔ مگر عقیدہ اسلامی تو مسلمانوں کے درمیان آج موجود ہے پھر وہ ان وحدت ساز فکری خصوصیات سے ہمکنار کیوں نہیں کرتا ؟ ہوسکتا ہے اسلامی عقیدے کے اصول دلوں میں پاکیزگی اور گہرائی کے پہلو سے اس مقام پر نہیں ہوں کہ ان سے وحدت ساز فکر کی قوت جنم لے ۔ یہ سبب کا ایک جزء ہے ۔ ہمارے خیال میں بڑا سبب وہی ہے جسے ہم نے پیچھے ذکر کیا یعنی آزادی رائے کا فقدان ۔ یہ وہ ضروری نشاط آور خوراک ہے جو فکر کی وحدت ساز خصوصیات کو اس استعداد

کے مقام سے جہاں اسلامی عقیدہ پہونچاتا ہے سرگرمی اور ظہور پذیری کے مقام پر لے آتی ہے ،تا کہ عملا فکری وحدت کا ظہور ہو جائے۔

ہمیں اس کی ضرورت نہیں محسوس ہوتی ہے کہ آج مسلمانوں کی زندگی میں استبداد کے پھیلاؤ کو ثابت کریں۔ یہ اتنی واضح صورتحال ہے کہ محتاج اثبات نہیں ہے۔ ہم آگے صرف یہ بتائیں گے کہ کس طرح جس استبداد کے رجحان نے آزادی رائے کا متعدد میدانوں میں گلا گھونٹا ،وہ ان منہجی خصوصیات کو مضمحل کر کے جو فکری وحدت کے ارکان کی حیثیت رکھتی تھیں مسلمانوں کے درمیان فکری وحدت کو پارہ پارہ کرنے کا بھی سبب بنا۔

سیاسی استبداد جو استبداد کا سب سے نمایاں رنگ ہے۔ ان خیالات اور نقطہ نظر کے اظہار کی سطح پر آزادی رائے کا گلا گھونٹتا ہے جو امت کے عام مسائل کے حل کے سلسلے میں پیش کئے جاتے ہیں جن میں اسباب کا بیان ہوتا ہے، علاج کی صورتیں پیش کی جاتی ہیں، ان کے لئے دلائل پیش کئے جاتے ہیں اور اس سلسلے میں سرکاری سطح پر جو فیصلے ہوتے ہیں پالیسیاں بنتی ہیں ان سے اختلاف بھی ظاہر کیا جاتا ہے۔

سیاسی استبداد آزادی رائے پر پابندی لگانے سے آگے بڑھ کر کبھی ان لوگوں کی سرکوبی بھی کرتا ہے جنہیں کسی بھی طریقے سے اظہار رائے کا موقعہ مل گیا ہو۔ یہ صورتحال زیادہ تر اسلامی ملکوں کی ہے ان میں درجات کا فرق ہوسکتا ہے لیکن نوعیت سب جگہ یکساں ہے۔

سیاسی استبداد نے آزادی رائے کو ختم کر کے مسلمانوں کی زندگی میں رونما ہونے والے حقیقی واقعات کے اسباب وعلاج پر غور کرنے سے قید و بند اور دار روسن کے ذریعہ دماغوں کو پھیر دیا۔ جس کے بعد یہ دماغ اپنی ذات میں سمٹ گئے۔ جب عالم حقیقی میں غور وفکر سے انہیں روکا گیا تو وہ خیالی دنیا میں گھومنے لگے۔ اس کے نتیجہ میں فکر ونظر میں مثالیت اور تجرید کا وصف داخل ہو گیا۔ جسے ہم نوجوانوں کی اس نسل میں بھی بھانپ سکتے ہیں جس نے اشتراکیت کو اختیار

کیااوراسی سے ایک مثالی تمدن کا خیالی شہر بسایا جس میں مطلق مساوات کی حکمرانی ہو۔اس کو ہم نوجوانوں کی اس نسل میں بھی بھانپ سکتے ہیں جو اپنے رب کی طرف پلٹی اور ایک ایسی اجتماعی زندگی کی آرزو دل میں بسائی جس کی قیادت دین کی ہمہ گیر قدریں کریں۔مگر جب ان کی شرعی آرزووں کے اظہار کی آزادی سلب کر لی گئی تو وہ خیالی فکر کی طرف لوٹ گئے اپنی آرزووں اور توانائیوں کو وہاں لٹایا اب واقعات کے ساتھ ان کا رویہ اپنے خیالات کو زبردستی منوانے والا ہو گیا ،حل کی وہ تجاویز جو حقائق کی دنیا سے کٹ کر اور اقدار اور اصولوں کی معیاری سطح پر بیٹھ کر تیار کی گئیں انہیں وہ زبردستی امت کے مسائل کے تعلق سے منوانا چاہتے ہیں۔یہی حال ہر اس گروہ کا ہے جس کی رائے پر پابندی لگادی گئی اور اس کی آزادی سلب کر لی گئی۔

مسلمانوں کی موجودہ صورتحال میں تربیتی استبداد بھی موجود ہے،تربیتی ادارے علمی مواد میں سے غیر دقیق انتخاب مربیوں کو دیتے ہیں یہ ایک طرح کی پابندی ہوتی ہے جو نسل نو کے ذہنوں پر مسلط کی جاتی ہے وہ مختلف معرفت کے سرمایوں سے آگاہ ہونے (جس کے ساتھ صحیح رہنمائی بھی ہو) کی آزادی کے حق سے محروم کردی جاتی ہے۔بہت سے تربیتی اداروں میں املا کرانے اور ٹھونسنے کا طریقہ اختیار کیا جاتا ہے جس میں پیش کردہ تعلیمی مواد پر تبصرے اور اظہار خیال کی آزادی سلب کر لی جاتی ہے۔یہ سب کسی خاص تربیتی مرحلے یا کسی خاص گروہ تک محدود نہیں ہے بلکہ یہ تقریبا عام رجحان ہے (ہندوستان کی ایک مشہور دینی درس گاہ میں چند سال قبل اکابر علم وفضل کے ذریعہ ایک ضابطہ اخلاق بنا کر اساتذہ پر پابندی عائد کی گئی کہ وہ کسی اختلافی موضوع پر نہ کتاب اور مضمون لکھ سکتے ہیں اور نہ تقریر کر سکتے ہیں۔کسی اعلی تعلیمی ادارے میں اس سے شدید پابندی کا تصور نہیں کیا جاسکتا (مترجم))۔

تربیتی مواد میں اس پابندی سے اور تبصرے اور اظہار خیال کی آزادی کو یوں سلب کر لینے سے ایسی نسلیں تیار ہوئیں جو فکری لحاظ سے لکیر کی فقیر رہ گئیں۔وہ مسائل پر گفتگو کرتے ہوئے محض ایک زاویے سے سوچتی ہے۔اس کے یہاں وہ تنقید وموازنے کی نگاہ ناپید ہے جو

متضاد چیزوں اور مختلف نقطہ ہائے نظر کے بیچ سے حقیقت کا سراغ لگا لیتی ہے۔ آج بہت سارے اسلامی گروہوں پر جس تعصب کا غلبہ ہے وہ اسی لکیر کی تنگ فکر کا مظہر ہے یا اس کا کڑوا پھل ہے۔ اس کے کڑوے پھلوں میں بہت سارے ان لوگوں کا رویہ بھی شامل ہے جو رایوں اور منتقل شدہ خیالات کو ان کی خامیوں کے باوجود قبول کرنے میں غفلت برتتے ہیں۔ ان کی بنیاد پر جو موقف اور نقطہ نظر وہ بناتے ہیں۔ وہ شاخ نازک پر بنے ناپائیدار آشیانے کی طرح ہوتا ہے۔ سبب یہی تنقید و تحقیق کی خاصیت کا فقدان ہے جس سے قوی کو ضعیف سے اور صحیح کو غلط سے جدا کیا جا سکے اور وہ خاصیت ایسی تربیت سے کیسے پیدا ہو سکتی ہے جس میں تنقید و تبصرہ اور اظہار خیال کی مشق نہ کرائی جائے بلکہ محض املا کرا کے ٹھونسنے کا طریقہ اختیار کیا جائے؟۔

بہت ساری اسلامی تحریکات بھی استبداد کی اس بیماری سے محفوظ نہ رہ سکیں جو عام اسلامی زندگی کو لاحق ہوئی۔ یہ تحریکیں اپنے کارکنوں میں آزادی رائے سلب کرنے کے مختلف طریقے اختیار کرتی ہیں۔ کیا سیکھیں اور کیا پڑھیں کی پابندی کہ مخصوص رنگ کے لٹریچر اور متعین مفکرین و مصنفین کو پڑھنے کی اجازت دی جاتی ہے۔ اپنے خیال کا اظہار اس پر بحث اور اس کے دفاع کا میدان حد درجہ تنگ کر دینا کہ اسی سے اطاعت، تعمیل حکم اور سپاہیانہ اوصاف کی تکمیل ہوتی ہے۔ ان سب چیزوں کے منفی اثر فکر کے ان اوصاف پر پڑے جن پر ان کی تربیت ہوئی۔ بہت سارے لوگ مثالیت، سطحیت اور لکیر پرستی کے شکار ہو گئے۔

اس نہج پر ہم اسلامی صورتحال میں استبداد کے مظاہر کا احاطہ کر سکتے ہیں اور جان سکتے ہیں کہ آزادی رائے پر پابندی کتنے وسیع پیمانے پر عائد کی گئی۔ اور اس پابندی نے اسلامی فکر میں اس کی وحدت ساز منہجی خصوصیات کا شیرازہ بکھیر کر کتنا انتشار برپا کیا۔

ہمہ جہت جائزے سے یہ بھی ممکن ہے کہ ان منہجی خصوصیات میں سے ہر ایک کے خلل کے لئے آزادی رائے کا خون کرنے اس کا گلا گھونٹنے یا اس کا دائرہ تنگ کرنے والے استبداد

کے کسی رویے کو ذمہ دار سبب بنایا جائے۔ آگے ہم کوشش کریں گے کہ ایک مقابل تصویر بنائیں اور یہ واضح کریں کہ موجود اسلامی صورتحال میں یہ کیسے ممکن ہوگا کہ آزادی رائے مسلمانوں کی فکری وحدت کے لئے ایک فعال محرک بن جائے اور یہ وحدت ثقافت، سیاست، مسلک اور تحریک میں بھی اسلامی وحدت کا سبب بنے

۲۔ آزادی رائے اور ثقافتی وحدت

ثقافتی لحاظ سے متحد امت وہ ہے جس کے افراد یکساں یا کم از کم قریب تر اسلوب پر جمع ہو جاتے ہوں مسائل کے نظریاتی حل میں اور زندگی کی عملی تعمیر میں، خواہ وہ انتظامی معاشی اور تمدنی نظام ہوں، فنون ہوں، اجتماعی تعلقات ہوں یا رسم و رواج ہوں۔ ثقافتی لحاظ سے منتشر امت وہ ہے جس میں ہر گروہ ان چیزوں میں الگ الگ اسلوب اختیار کرے۔

اسلامی ثقافت یا زندگی کی اسلامی طریقہ پر تعمیر میں یہ وصف اسی وقت پیدا ہوگا جب کہ وہ دو بنیادی عناصر پر قائم ہو۔ اول عقیدہ شریعت اور اخلاق کی ٹھوس اسلامی قدریں۔ دوم وہ وسائل جو حالات کی تبدیلی سے خود بدلنے کی صلاحیت رکھتے ہوں اور ان ٹھوس قدروں کو بہتر طریقہ سے حقیقت کا روپ دے سکتے ہوں۔ اور اس کے لئے ضروری ہے کہ نظریاتی اور عملی معرفت میں وہ عام انسانی کسب سے مستفید ہوں۔ جب مسلمان اپنی زندگی ایسے اسلوب پر قائم کریں گے جو پہلے عنصر کو لیتا ہو اور دوسرے کو چھوڑ دیتا ہو تو ان کی ثقافت پسماندہ اور ناقص ہوگی۔ اور اگر اسے ایسے اسلوب پر استوار کریں گے جو دوسرے عنصر کو لے اور پہلے کو چھوڑ دے تو وہ گمراہ ثقافت اور ہو سکتا ہے سیاہ کار ثقافت ہو۔ صحیح اسلامی ثقافت وہ ہے جس میں دین کی ٹھوس قدریں مسلسل ترقی کرتے ہوئے انسانی کسب معرفت سے ہم آہنگ ہوں۔

اس بنا پر مسلمانوں کے درمیان ثقافتی وحدت اس وقت تک وجود پذیر نہیں ہو سکتی جب تک ان کی زندگی کی تکمیل کے لئے دونوں عناصر پر قائم وحدت ساز اسلوب پر ان کا اتفاق نہ ہو۔

اس وحدت ساز اسلوب کا وجود جبھی ممکن ہے جب آزادی رائے کا ماحول فراہم کیا جائے جس میں ذہنوں کو دونوں عناصر یعنی دین کی ٹھوس قدریں اور انسان کے کسب معرفت سے ایک ساتھ روشناس ہونے کا میدان ملے ،۔مزید برآں پابندی اور کسی ایک پر اکتفا کرنے کی نگاہ بندی نہ ہو۔

پہلے عنصر کے لئے ذہنوں کے دروازے وا کرنے کا اصل ماخذ یعنی قرآن وسنت پر مشتمل دینی قدروں اصولوں اور احکام کی تعلیم ۔اس قدیم اسلامی لٹریچر کی تعلیم جس نے ان قدروں اور اصولوں کی تشریح تفصیل اور قانون سازی کی اور عمل کی بساط پر اسے ایک بھر پور تجربے کی حیثیت سے منطبق کیا،جس سے تطبیقی فقہ کے وہ ثمرات ملے جن سے کسی بھی نسل میں مسلمان بے نیاز نہیں ہو سکتے ۔قدیم کی یہ تعلیمی جہت بلا قید تمام اسلامی مسلکوں پر مشتمل ہوگی بلکہ ان مسلکوں پر بھی مشتمل ہوگی جو خود اسلامی ہونے کے دعویدار ہیں مگر حقیقت میں اس سے باہر ہیں ۔اس طرح اسلامی دماغ کے سامنے اسلامی ثقافت کے پہلے عنصر کا پورا مادہ بلا کم وکاست مہیا ہو جائے گا اس میں حال کے درپیش موضوعات کے سلسلے میں ضروری اور کافی معلومات سے آگاہ ہونے پر کوئی روک یا قید نہیں ہوگی ۔

دوسرے عنصر کے لئے ذہنوں کو وا کرے گی مغربی تہذیب کی (اس لحاظ سے کہ معرفت کے میدان میں وہ انسانی کسب کی اوج کی حیثیت رکھتی ہے) اور اس کی عام مذہبی اور فلسفیانہ روح سے نکلی ہوئی جڑوں کی تعلیم ۔اس تعلیمی جہت میں مختلف فلسفیانہ مذاہب ،دینی رجحانات ،سیاسی اور اقتصادی نظام ،سماجی مظاہر اور ان کے سلسلے میں انسانی صورتحال ،کائناتی علوم خاص طور سے اپنے فلسفیانہ ابعاد کے ساتھ شامل ہوں گے ۔ یہاں تک کہ اس تہذیب کے سارے پہلو غور وفکر کا مادہ بنیں گے ان میں سے کسی بھی چیز کو کسی بھی وجہ جواز سے دور نہ کیا جائے گا ۔اور یوں اسلامی دماغ کو انسانی معرفت کے کسب کا پورا سرمایہ اس کی صورتحال اور اس کے ابعاد کی شکل

میں مہیا ہو جائے گا۔ اس طور سے کہ اسلامی ثقافت کی تعمیر میں یہ دوسرا عنصر ہے۔

دونوں عناصر کے سلسلے میں مکمل معلومات کے دروازے کھول دینا اس آزادی کے لئے کافی نہیں ہے بلکہ اس کے بعد یکساں طور سے دونوں ہی عناصر کی معلومات پر تنقیدی نگاہ ڈالنے کی آزادی بھی ملنی چاہئے۔ پہلے عنصر کے سرمائے میں تنقیدی نگاہ شریعت کے احکام کے اثبات اور فہم میں آزادی سے حاصل ہوگی۔ یہ نصوص سے استنباط کے ذریعہ ہو یا جس میں نص نہ ہو اس میں کلی اصول وقواعد اور مسلمانوں کے موجودہ حالات کے ماضی کی نظیر سے خالی نئے مسائل کے شرعی حل کے تقاضے کے مطابق ہو۔ اسی طرح تنقیدی نگاہ فقہ اور عقیدہ کے روایتی مسلکوں کو یکساں طور سے تحقیق اور تقابل کی بساط پر ڈال کر حاصل ہوگی تا کہ اسے منتخب کیا جائے جو نئے تقاضوں کے ساتھ موجودہ زندگی کی دین کے منہاج پر تعمیر کے لئے موزوں تر ہو۔ اور یہ اجتہاد کی آزادی کے دائرے میں شامل ہوگا۔

دینی احکام اور روایتی مسلکوں کے سرمائے میں تنقیدی اجتہاد کی آزادی آج تن تنہا مسلمانوں کو موجودہ زندگی کی تعمیر کے ایسے اسلوب پر متحد کرنے کا ذمہ لے سکتی ہے جو نئی افتادوں کا سامنا کرنے کے لئے ہمہ وقت تیار رہے۔ ہاں قدیم ورثہ پر اسی صورت میں جمود جس صورت میں اس نے ماضی کے مسائل کا علاج کیا تھا اور اسی صورت کو ساتھ رکھنا اس امید پر کہ وہ حال اور مستقبل کے مسائل بھی حل کرے۔ یہ بہت سارے مسلمانوں کو اس فتنہ میں ڈالنے کا سبب ہوگا کہ وہ اس ورثہ ہی کو سرے سے خیر باد کہیں اور انسانی قوانین کے ذریعہ مسائل زندگی کے موہوم حل کے دلدل میں جا گریں۔ آج آزاد تنقیدی اجتہادی نگاہ پر مختلف طرح سے پابندی عائد کرنے کی وجہ سے اجتہاد میں کوتاہی کے باعث عملا یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔ یہ پابندی بظاہر اعلان شدہ نہیں ہے مگر عملا موجود ہے۔ اور اس سے چھٹکارے کی کوششیں ابھی تک حیاداری کے مرحلے میں ہیں۔

دوسرے عنصر کے سرمائے یعنی انسانی معرفت کی کمائی میں تنقیدی نگاہ کی آزادی کو ایک وسیع تنقیدی تحریک کی شکل اختیار کرنا چاہئے۔ جس میں عقلی دلائل کے ذریعہ اور انفرادی واجتماعی زندگی پر عملی اثرات کے حوالے سے حق باطل سے ممتاز ہو جائے۔ یہ بھی واضح ہو جائے کہ کائنات اور انسانی علوم میں سے برحق کیا ہیں اور کس میں فریب کاری یا نگاہ بندی کا دخل ہے ان چیزوں میں جن کا ثقافتی آئیڈیا لوجیکل ابعاد سے تعلق ہو۔ یہ ابعاد علوم کی افزائش سے جدا نہیں ہوتے، یہاں تک کہ کائناتی علوم سے بھی، نظریہ ارتقاء اس کی واضح مثال ہے۔ یہ تنقیدی تحریک ہر اس چیز کو دور کر دے گی جو دین کی قدروں اور اس کے احکام کی صریح طور سے مخالف ہو اور اسے بھی جس میں تلبیس اور نظر بندی کا عنصر ان سے منافی ہو اگر چہ جس چیز میں تلبیس یا نظر بندی ہو وہ خود منافی نہ ہو۔ پھر یہ تحریک باقیماندہ تہذیبی اثاثے کو پیش کرے گی تا کہ اسلامی ثقافت کی وحدت کی تعمیر میں وہ صالح مواد کے طور پر استعمال ہو۔ اس تنقیدی تحریک کی غیر موجودگی میں مسلمانوں کا بڑا حصہ اس تہذیبی اثاثے کو کلی طور سے ٹھکرانے کا موقف اختیار کرے گا اس بنیاد پر کہ اس میں دین مخالف عنصر موجود ہے۔ اور تب وہ روایتی ورثے کو اپنی ثقافت کے لئے واحد مرجع مان کر اس میں سمٹ جائے گا۔

اگر اپنے ورثے کے ساتھ اور انسانی معرفت کے اثاثے کے ساتھ بھی کشادہ ظرفی اور تنقید پر مبنی معاملہ کیا گیا تو ایک متحدہ ثقافتی رخ ملے گا جس میں مغرب سے متاثر لوگ بھی اس ورثے کی طرف آئیں گے جسے تنقید نے جلا بخشی ہوگی اور قدیم پسند اس انسانی اکتساب کی طرف آئیں گے جس کو تنقید کے ذریعہ پاک کر دیا گیا ہوگا۔ اس طرح دونوں کناروں کا ایک متحدہ اسلوب پر سنگم ہوگا جو دین کی قدروں اور احکام پر قائم ہوگا اور جسے صحیح انسانی کسب سے تقویت ملے گی۔ اور اس متحدہ اسلوب پر اسلامی زندگی زمین کی تعمیر اور اس میں خلافت کے قیام کے لئے آگے بڑھے گی۔

۳-آزادی رائے اور مسلکی وحدت

مسلمان فقہ اور عقیدے میں متعدد مسلکوں سے منسوب ہیں، فقہ میں آج اہم چار ہیں: حنفی شافعی، مالکی اور حنبلی جبکہ عقیدے میں تین: سنی، شیعہ اور اباظی۔ ان مذاہب سے نسبت میں شدت بھی آجاتی ہے جو افتراق کا سبب بن جانے والے تعصب تک چلی جاتی ہے۔ آج اس میں سے سنی شیعہ افتراق زیادہ نمایاں ہے۔

مسلکی وحدت کے بھی دو درجے ہیں۔ پہلا یہ کہ مسلمان ایک ایسے مسلک پر متحد ہو جائیں جو تمام مذاہب سے مستفاد ہو اور بنیادی طور پر قرآن وحدیث کے نصوص سے براہ راست رشتے پر قائم ہو۔ دوسرا درجہ یہ ہے کہ مسلمان اپنے مسلکوں میں ایک دوسرے سے ممکنہ حد تک قریب ہو جائیں اور کچھ خاص امور میں جن پر ہر مسلک والا باقی رہے ایک دوسرے کو گنجائش دیں۔ ساتھ ہی جھگڑے اور منافرت کے مظاہر کو دور کر دیں۔ پہلے درجہ کی وحدت آج خاص طور سے اعتقادی مسلک کی سطح پر بہت دشوار طلب معلوم ہوتی ہے مگر دوسرے درجے میں یہ ممکن اور آسان ہے۔ اور اگر یہ ہوگئی تو پہلے درجہ کی وحدت کے لئے یہ خود راستہ بن جائے گی۔

دونوں طرح کی مسلکیت قدیم تاریخی پیداوار ہے۔ مسلکوں کی حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ اسلام پر عمل آوری کے اعتقادی ایمان اور شرعی رویہ کی صورت میں مختلف طریقے ہیں۔ یہ دین کی تطبیق کی کیفیت کے سلسلے میں اجتہادات ہیں جن میں وحی کے نصوص ان کلی حالات وظروف کے ساتھ ہم آہنگ ہوئے جو اس وقت مسلمانوں کی زندگی کو درپیش تھے۔ گویا مسلکوں کا ان حالات سے گہرا تعلق ہے جن میں ان کی نشو ونما ہوئی۔ لیکن ان کے ماننے والوں نے انہیں تاریخ کے سفر میں اس وقت بھی ساتھ رکھا جب حالات بہت بدل گئے۔ مسلکیت کا اجتہاد کو مالا مال کرنے اور دین پر عمل آوری میں اسلامی تجربے کو وسعت دینے میں غیر معمولی رول تھا جس سے ایک ایسا اعتقادی اور فقہی مجموعہ تیار ہوا جس کی نظیر کسی بھی قوم میں ملنا مشکل ہے۔ اس نے اس پہلو سے بہت ہی بڑا خزانہ دیا جس سے آنے والی اسلامی نسلوں میں سے کوئی بھی

نسل بے نیاز نہیں ہوسکتی بلکہ وہ عام انسانی دائرے میں بھی ایک قابل قدر انسانی ورثہ ہے۔

تاہم یہ معقول وجہ جواز نہیں ہے کہ مسلمان آج بھی اس مسلکی نسبت پر قائم رہیں جس میں شدت کبھی اس قدر رہو جاتی ہے کہ مار پیٹ کی نوبت آجاتی ہے۔ حالانکہ امت کی وحدت دین کا ایک ضروری مقصد ہے۔ اس طرز کی مسلکیت دراصل ایک طرح سے تاریخ کے ان گذشتہ اجتہادات سے لپٹے رہنا ہے جو اس وقت کے ان حالات کی پیداوار تھے جن میں سے کچھ آج بالکل ہی بدل گئے ہیں۔ ایسا آزادی رائے پر یک گونہ پابندی لگانے سے ہوا۔ اس سے چھٹکارا پاکر ایسی پوزیشن میں آنا جو دین پر عمل آوری میں آزادی پر قائم ہو ایسی وسیع اجتہادی تحریک کی محتاج ہے جو اعتقاد اور شریعت دونوں میں یکساں طور سے آزادی رائے پر قائم ہو۔

اعتقاد کے میدان میں سنی، شیعہ اور اباضی مسلکوں کی نشوونما اولین اسلامی تاریخ کے فتنوں کے واقعات سے پیدا شدہ حالات میں ہوئی ان کے ستونوں کو قوت اس بحث سے ملی جو داخلی سطح پر ان کے درمیان چھڑی اور جو خارجی سطح پر ان کے اور دیگر مذاہب اور تہذیبوں کے درمیان چھڑی۔ ان واقعات وحالات نے اس وقت متعین مسائل اور متعین اسالیب طے کئے جو مسلکیت کے بنیادی محور بن گئے۔ مثال کے طور پر انہیں میں سے اللہ کی ذات اور اس کی صفات کے درمیان تعلق کا مسئلہ ہے۔ اللہ کے کلام کے قدیم اور حادث ہونے کا مسئلہ ہے۔ اللہ کی خبری صفات کی تاویل اور تفویض کا مسئلہ ہے، اللہ کی رؤیت کے امکان اور عدم امکان کا مسئلہ ہے۔ اس وقت وہ حالات اور وجوہات تھیں جو ان میں گفتگو کا محرک اور مسلکیت کے قیام کا سبب بنیں۔ اب ایک زمانے سے ان کا وجود بھی نہیں رہا۔ تو کیا اب کوئی جواز ہے کہ مسلمان ان مسلکوں میں بکھرے رہیں جو اپنے وجود کا جواز کھو چکے ہیں؟

ہمارے نقطہ نظر سے دماغوں کو اعتقادی دینداری میں ان مسلکی بیڑیوں سے آزاد ہونا چاہئے اور آزادی کے ساتھ اعتقادی غور وفکر کا رخ ان بڑھتے ہوئے نئے چیلنجز کی جانب کرنا

چاہئے جو اسلامی عقیدے کو ہدف بنائے ہوئے ہیں اور مسلمانوں کے دماغوں میں جا کر اس کی تحریف کی دھمکی دے رہے ہیں جبکہ وہ اپنی تاریخی مسلک پرستی میں گم ہیں۔ اگر مسلمانوں کے دماغ آزادی کے ساتھ ان چیلنجز کا جواب دینے کے لئے متوجہ ہو جائیں جن کی دھمکی مادیت کے مختلف علمبردار مختلف طریقوں سے دے رہے ہیں تو مسلمان اپنے آپ کو اعتقادی جہاد کے ایک متحدہ محاذ پر پائیں گے جو بنیادی نقطہ انطلاق قرآن وحدیث سے لے گا اور ایک مشترک ایمانی پلیٹ فارم بنائے گا جو مسلمانوں کے تمام اجتہادات اور فروعی تصرفات کے لئے رہنما پس منظر بنے گا۔ ساتھ ہی پوری اسلامی زندگی کا مشترک دائرہ بھی بنے گا جس میں پرانی مسلکیت بتدریج گم ہو جائے گی۔ اسلام کے خلاف اٹھنے والے چیلنجز کا سامنا کرنے کے لئے اعتقادی پیش قدمی اپنے آپ میں دماغوں کو ماضی کی پیداوار سے لپٹے رہنے سے آزاد کرے گی اور اعتقاد کی سطح پر انہیں مستقبل کی سمت امت کی قیادت کے لئے متحد کرے گی۔

فقہی مسلکیت کا معاملہ بھی یہی ہے بلکہ وہ زیادہ آسان ہے کیونکہ فقہی مسالک دین کے اصولوں کے ساتھ نہیں بلکہ فروعات سے بحث کرتے ہیں۔ فقہی تعصب زدہ مسلکیت سے چھٹکارا اجتہادی آزادی کے ذریعہ ہی ملے گا جس میں دماغ موجودہ عملی چیلنجز کی طرف رخ کریں گے تاکہ ان کے علی الرغم اسلامی زندگی کی صحیح دینی رہنمائی کریں، یہ آزاد اجتہادی پیش قدمی دماغوں کو مجبور کرے گی کہ وہ تمام مسلکوں کی فقہ کو اپنے لئے عام مرجع بنائیں اور اس سے نئے مسائل کو شریعت کی رہنمائی سے ہم آہنگ کرنے کے لئے مدد لیں۔ اور اس وقت مصروفیت صورتحال سے وابستہ اور نگاہ مستقبل پر مرکوز ہوگی تاکہ ہر روز تیز رفتار زندگی کے سمندر سے اٹھنے والے نئے نئے چیلنجز کا سامنا کیا جا سکے۔ یہ تبدیلی ماضی کو اس سے باز رکھے گی کہ وہ فقہی تعصّبات کو طاقتور بنانیوالا محرک بنے۔ اور تب مسلمان زندگی کو شریعت کے رنگ میں ڈھالتے ہوئے خود کو متحد یا قریب تر مسلک پر پائیں گے۔

۴-آزادی رائے اور سیاسی وحدت

مسلمانوں کے درمیان سیاسی وحدت کے بھی مسلکی وحدت کی طرح دو درجے ہیں پہلا درجہ ہے ہمہ گیر سیاسی وحدت ،بایں معنی کہ ایک اسلامی سلطنت میں سب دھڑے ضم ہوجائیں۔دوسرا درجہ یہ ہے کہ امت کے اندر ہونے والے داخلی واقعات کے دائرے میں بھی اور بین الاقوامی کشمکش اور معرکہ آرائی میں بھی جس سے دنیا آج گذر رہی ہے موقف میں اتحاد ہو جائے۔اور گوکہ پہلے درجے کی سیاسی وحدت مسلمانوں کے نزدیک بلند ترین ہدف ہے۔اور لگتا ہے کہ اس کی منزل ابھی دور ہے۔دوسرے درجے کی وحدت دشوار طلب نہیں ہے اور وہ ہمہ گیر وحدت کے لئے ناگزیر قدم ہے۔

آج کے موجودہ سیاسی افتراق کے اسباب کا بڑا حصہ اگرچہ مسلمانوں کی ہمہ جہت پسماندگی کے اسباب سے اور اسی طرح عالمی سامراجیت اور بین الاقوامی غنڈہ گردی سے تعلق رکھتا ہے مگر ان اسباب کا ایک حصہ اس استبداد سے بھی متعلق ہے جسے اسلامی اقوام جھیل رہی ہیں اور جو وحدت کی حفاظت اور افتراق سے بچاؤ کے حوالے سے آزادی رائے پر پابندی لگاتا ہے۔اس لئے اسلامی سیاسی وحدت کے قیام کے لئے آزادی رائے کا بڑا رول ہوگا۔

ملکی سطح پر سیاسی آمریت جو آزادی رائے کو سلب کرتی ہے وہ حقیقت میں اس دھماکے کے اسباب اکٹھا کر رہی ہے جو کسی دن ضرور رونما ہوگا۔اس کی علامتیں یہاں بھی نظر آرہی ہیں اور دوسرے اسلامی ملکوں میں بھی۔اور اگر آزادی اظہار حاصل ہوجائے خواہ کچھ کنٹرول میں سہی تو ایک طرف سیاسی پارٹیوں اور دھڑوں میں اور دوسری طرف حکمراں اداروں اور عوام کے درمیان قربت کا باعث ہوگی۔اس لئے کہ آزادی رائے گفتگو کے اس ماحول کو پیدا کرے گی جس میں امت کے مسائل ومعاملات کے حوالے سے رایوں میں کشاکش ہوگی اور یہ کشاکش بالآخر اتفاق کی قدر مشترک تک پہونچے گی۔وہ تناؤ کم ہوگا جو سیاسی سرکوبی کے سبب پیدا ہوتا ہے۔اور اس

فریق کو بھی قدرے تسلی ہو جائے گی جو اپنی رائے کا اظہار کر کے اس کے لئے بحث کرتا ہے گو کہ اس کی رائے عملاً مانی نہ جائے۔ عوام کے حالات پر غور کرنے سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ جہاں عوام کو سیاسی آزادی رائے زیادہ حاصل ہوتی ہے وہاں سیاسی وحدت زیادہ طاقتور ہوتی ہے۔ اسلامی عوام میں سیاسی آزادی رائے کے بہت کم نمونے ہیں مگر جو ہیں وہ اس تجزیے کو قوت پہنچاتے ہیں۔

عام اسلامی دائرے میں سیاسی آزادی رائے یہ ملکہ رکھتی ہے کہ اسلامی اقوام کی باہم قربت کا باعث بنے اور انہیں وحدت کی منزل کی طرف ان متعدد راستوں سے آگے بڑھائے جنہیں ہم آج سیاسی جبر کے باعث مسدود دیکھ رہے ہیں۔ ان پر ہمیشہ اقتدار کا پہرہ نہیں رہا ہے بلکہ بعض دفعہ اسلامی سیاسی شعور میں کمی بھی اس کی وجہ بنتی ہے۔

ان راستوں میں سے ایک سیاسی آزادی رائے ہے جس سے توقع کی جاسکتی ہے کہ عالم اسلام میں عالمی سامراجیت کے ٹھکانوں کا پتہ لگا سکے اس کے تاریخی اور آئیڈیالوجیکل اسباب کی کھوج کر سکے۔ اور ان بہت سارے واقعات کی حقیقت سے پردہ اٹھائے جو مسلمانوں کے ساتھ جگہ جگہ پیش آرہے ہیں۔ اس وقت ایک مشترک اسلامی رائے بنے گی جس میں عالمی کشمکش اور اس میں امت اسلامیہ کی پوزیشن کا شعور عام ہوگا۔ اور اسی کے بعد بین الاقوامی اجارہ داری کا مشترک مقابلہ کرنے کی راہوں کا بھی شعور پیدا ہوگا۔ اس وقت عام انسانی مسائل اور عالمی واقعات کے مقابلے کے سلسلے میں موقف یکساں یا قریب تر ہو جائیں گے۔ ہمیں یقین ہے کہ اگر سیاسی آزادی رائے عرب ملکوں اور اسلامی مشرق وسطی میں عام ہوتی تو ملکوں اور عوام کی سطح پر مسلمانوں کے موقف اس وقت اس قدر المیاتی طور سے متضاد نہ ہوتے جب اس علاقے پر حالیہ بحران نازل ہوا۔ انہیں راہوں میں سے یہ بھی ہے کہ سیاسی آزادی رائے عالم اسلام میں علاقائی عصبیتوں کو کمزور کرے گی، جو اسلامی نسبت کو قربان کر کے بہت زیادہ پھیل گئی ہیں۔ یہ اس

وقت ہوگا جب آزادی رائے اس حقیقت سے پردہ اٹھائے گی کہ ترقی ،تعمیر اور خارجی سلامتی فراہم کرنے میں تنگ علاقائیت ناکافی ثابت ہوتی ہے۔اس سب کا حقیقی معنوں میں ذمہ اسلامی نسبت ہی لے سکتی ہے کیونکہ عالم اسلام میں ہمہ پہلو زبردست امکانات موجود ہیں۔اس وقت تنگ علاقائیت سے لگاؤ وسیع اور طاقتور اسلامیت کے لگاؤ میں تبدیل ہوجائے گا اور اس سے اسلامی مستقبل کی وحدت کا مشترک احساس پیدا ہوگا جو موقف میں وحدت کا باعث ہوگا اور اصل مطلوبہ وحدت سے قریب بھی کرے گا۔ہم ابلاغ کے منبروں پر دیکھتے ہیں کہ عالم اسلام میں تنگ علاقائیت کا چرچا اس طرح کیا جاتا ہے کہ عام اسلامی وسعت کا کوئی اثر نہیں دکھائی دیتا۔اسی طرح مسلمانوں کے دماغوں پر سخت گیر پابندی لگادی جاتی ہے کہ وہ دوسرے مسلمانوں کی صورتحال سے آگاہ ہوں۔بھلا اس کے بعد وہ مسلمانوں کے ساتھ ان کے مسائل میں ہمدردی کیسے رکھیں گے اور اس قدر مشترک کا شعور انہیں کیسے حاصل ہوگا جس کی بنیاد پر پوری امت کو بین الاقوامی میدان کارزار میں لے جایا جاسکے؟۔

سیاسی آزادی رائے ہی تنہا مسلمانوں میں سیاسی وحدت کا شعور بیدار کرنے اور پھر اس وحدت کے لئے عملی راہ پر آگے بڑھانے کی ضمانت لے سکتی ہے۔

۵-آزادی رائے اور تحریکی وحدت

ایسا لگتا ہے کہ اسلامی تحریکات جو امت کا درد لے کر اٹھی تھیں اور اس کی وحدت کا خواب دیکھ رہی تھیں خود بھی ان آفتوں کا شکار ہوگئیں جن کا امت عمومی طور سے شکار تھی۔انہیں میں استبداد کی آفت ہے۔اس میں تعجب بھی نہیں ہونا چاہئے کیونکہ ان تحریکوں نے اس امت کی سرزمین سے جنم لیا ہے،وہ بھی پسماندگی کی اس میراث سے بوجھل ہیں جسے امت صدیوں سے ڈھورہی ہے۔گوکہ اس کا تناسب بہت کم ہے کیونکہ اسلامی کوششوں نے ان تحریکوں کو نکھار دیا ہے۔

اسلامی تحریکات عمومی طور سے عالم اسلام میں کثیر تعداد میں ہیں اور ایک ہی اسلامی ملک میں بسا اوقات بہت زیادہ تعداد میں ہیں۔ اکثر ان تحریکات کے عام دائرے میں اور خاص طور سے اسلامی دائرے میں آپس میں اختلافات بھی ہیں اور یہ اختلافات کبھی فتنہ کی حد تک پہنچ جاتے ہیں جبکہ سب کا مقصد خلوص بھرا مقصد وحدت ہے۔ پھر اس مصیبت کا سبب کیا ہے؟

ہم سمجھتے ہیں کہ اس کا ایک اہم سبب یہ ہے کہ بہت ساری اسلامی تحریکات ایسا منہاج اختیار کرتی ہیں جو تربیت اور تحریک دونوں ہی میدانوں میں یکساں طور سے آزادی سلب کرنے پر قائم ہے۔ عالم اسلامی کی بیشتر تحریکات اس ردعمل کی کیفیت سے سرشار ہوئیں جس کا اظہار امت نے قدامت پرستی اور مغرب زدگی کو ٹھکرا کر کیا۔ اس طرح ان کی حیثیت حال کو ٹھکرانے اور بہتر مستقبل سے لو لگانے والے نخل امید کی ہوگئی۔ یہ کیفیت اس کا باعث بنی کہ عام مفہوم میں جہادی اساس ہی بیشتر اسلامی تحریکات کی تشکیل کی اساس بنے۔ اور کیا جہادی تحریک سخت تربیتی اور تحریکی ڈسپلین کے بغیر رہ سکتی ہے؟ اس وجہ سے اکثر تحریکات صاف اور صالح مواد کے ایک ہی رنگ تک تربیت کو محدود کر کے فکری تربیت کے سلسلے میں آزادی کا دائرہ بہت زیادہ تنگ کرنے لگیں تاکہ ڈسپلن، اطاعت اور تعمیل حکم کی ضمانت ملے جو جہادی غایت کے لئے موزوں ہوتی ہے۔

اس تربیتی ماڈل نے جس میں عام ثقافت اور مخالف آراء اور مذاہب سے واقفیت کی آزادی تنگ ہو جاتی ہے۔ اور جس میں تحریکی امور پر گفتگو کی آزادی نیز اظہار رائے اور بحث کی آزادی پر قدغن لگا دیا جاتا ہے، اسلامی تحریکات میں بہت ساری دراڑیں پیدا کر دیں۔ ایک ایک تحریک کے اندر بھی اور تحریکوں کے درمیان بھی۔ کیونکہ جب کسی کی طرف سے کسی بھی وجہ سے مخالف رائے سامنے آتی تو اسے دوسروں کے یہاں بہت بڑا خطرہ تصور کیا جاتا۔ اسے مختلف القاب سے نوازا جاتا۔ اس کی جرأت کو بہت بڑا گناہ قرار دیا جاتا۔ مگر پھر دیکھتے دیکھتے ایک گروپ بن جاتا جو کھلی ہوئی دشمنی تک پہونچ جاتا۔ میدان میں موجود اسلامی تحریکات میں اس کی

بہت زیادہ مثالیں ہیں۔

اس بنا پر آزادی رائے کا اسلامی تحریکات کی ذاتی اور ہمہ گیر وحدت کے تحفظ میں بڑا کردار ہے۔ یہ آزادی اس کی ضامن ہے کہ مختلف رجحانات اور مذاہب کے لئے کشادہ اور وسیع تربیتی مواد پر افراد کی تربیت کرے۔ یہ اس کی ضامن ہے کہ ان کی ہر چیز میں شورائیت اور درپیش مسائل میں دلیل اور برہان کے پیمانوں کے ساتھ آزاد تبادلہ خیال کی تربیت دے۔ یہ اسکی بھی ضامن ہے کہ دماغوں کا رخ خیر وشر پر مشتمل وسیع وعریض حقائق کی دنیا کی طرف کرے، جہاں سے اس کی اصلاح کا آغاز ہو، ایسا نہ ہونے دے کہ وہ مثالی اور خیالی دنیا میں گم ہو جائیں یہاں تک کہ جب حقیقت کی دنیا میں اترنا ہو تو وہ صدمہ پہنچے جو تحریک کے جسم کو پارہ پارہ کر دے۔

اسلامی تحریک میں یہ آزاد تربیت عام ہو کر باہمی گفتگو سے انحراف، انتہا پسندی اور غلطی کو چھانٹ دینے کا بہترین طریقہ ثابت ہوگی۔ نیک اور مخلص دماغ کسی رائے کی اس قدر مشترک پر آپس میں ملیں گے جو عزم سے لبریز ہوگی پس سب اس کے سامنے سر تسلیم خم کر دیں گے کیونکہ وہ سب کی رائے ہوگی چاہے یہ ایک تحریک کے اندر ہو یا تحریکوں کے عمومی دائرے میں ہو۔

ہماری بات کا مصداق (جو محض اتفاق نہیں ہے) یہ ہے کہ جو اسلامی تحریکات آزادی رائے کے میدان کو زیادہ کشادہ رکھتی ہیں وہ زیادہ متحد اور مستحکم ہیں۔ سوڈان اور تونس کی اسلامی تحریکیں اس کی نمایاں مثال ہیں۔

گویا یہ کہا جا سکتا ہے کہ آزادی رائے حقیقت میں مسلمانوں کی وحدت کا اہم دروازہ ہے کیونکہ وہ ذہنوں میں مشترک منہجی اوصاف پیدا کرتی ہے جو ملاقات گفتگو اور تبادلہ خیال سے ظہور میں آتے ہیں۔ اس سے ایک فکری وحدت وجود میں آتی ہے۔ جو تجزیہ، تعلیل اور فیصلے میں باہمی قربت کا سبب بنتی ہے۔ مسلمانوں کو اہداف کی وحدت اور ان اہداف تک پہنچانے والے

طریقہ کار میں وحدت سے ہمکنار کرتی ہے۔قرآن کریم نے ہمیں بتایا ہے کہ امت کو جمع کرنے والی چیز بس امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے سلسلے میں آزادی رائے ہے۔ اور یہی فلاح وکامیابی کی گرہ ہے۔اللہ تعالی فرماتا ہے:

{ وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعرُوفِ وَيَنْهَونَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَأُولٰئِکَ هُمُ المُفْلِحُونَ ۔وَلاَ تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا واخْتَلَفُوامِنْ بَعْدِ مَا جَاءَ هُمُ الْبَيِّنَاتُ وَأُوْلٰئِکَ لَهُم عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴾(سورة آل عمران: ۱۰۴-۱۰۵)

(تم میں تو کچھ لوگ تو ایسے ضرور ہی ہونے چاہیئں جو نیکی کی طرف بلائیں، بھلائی کا حکم دیں، اور برائیوں سے روکتے رہیں۔ جو لوگ یہ کام کریں گے وہی فلاح پائیں گے۔ کہیں تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جو فرقوں میں بٹ گئے اور کھلی کھلی واضح ہدایات پانے کے بعد پھر اختلاف میں مبتلا ہوئے۔ جنھوں نے یہ روش اختیار کی وہ اس روز سخت سزا پائیں گے)۔

☆ ☆ ☆

مصنف کے بارے میں

- ملک تونس کے جنوبی حصہ میں سکونت پذیر خاندان بنی خداش سے تعلق ہے۔ ۲۸ مئی ۱۹۴۵ء مطابق ۱۵ جمادی الثانی ۱۳۶۴ھ میں ولادت ہوئی۔
- کلیۃ الزیتونیۃ سے ۱۹۷۲ء میں دینیات سے گریجویشن کیا۔
- جامعہ ازہر مصر کی کلیۃ اصول الدین سے عقیدۃ اور فلسفۃ میں ایم اے ۱۹۷۴ء میں کیا۔
- جامعہ ازہر سے ۱۹۸۱ء میں اصول الدین میں ڈاکٹریٹ کی تکمیل کی۔
- ۱۹۷۴ء سے کلیۃ الزیتونیۃ تونس میں عقیدہ کی تدریس کا آغاز کیا۔
- ۱۹۸۰ء میں صدر شعبہ مقرر ہوئے۔
- وزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے عمان یونیورسٹی اردن، الجزائر یونیورسٹی، امیر عبدالقادر اسلامی یونیورسٹی الجزائر وغیرہ میں تدریسی خدمات انجام دیں۔
- موصوف کی متعدد کتابیں اور تحقیقی مقالات ہیں جن میں سے بعض حسب ذیل ہیں:
  - ☆ **المهدي بن تومرت :حياته و آراؤه و أثره بالمغرب**
  - ☆ **تجربة التغيير في حركة المهدي بن تومرت**
  - ☆ **العقل والسلوک في البيئةالاسلامية**
  - ☆ **المعتزلة بين الفكر والعمل (اشتراک سے)**
  - ☆ **فقه التدين :فهما وتنزيلا**
  - ☆ **خلافة الانسان بين الوحي والعقل**